فہرست مضمون نگارانِ معارف

جلد ۹۳

از جنوری ۱۹۶۴ء تا جون ۱۹۶۴ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

شمار	اسمائے گرامی	صفحہ	شمار	اسمائے گرامی	صفحہ
۱	جناب مولوی ابوالبقا صاحب ندوی	۲۷۳	۹	جناب سید ذوالفقار حسین صاحب بخاری ایم اے لکچرار اسلامیہ کالج لائل پور	۲۴۵
۲	جناب مولوی احتشام احمد صاحب ندوی ایم اے ریسرچ اسکالر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ	۳۰۴	۱۰	جناب عماد الملک سید حسین صاحب بلگرامی	۱۵۰-۳۱۳
۳	جناب مولانا احمد سعید صاحب دہلوی	۳۹۰	۱۱	جناب شبیر احمد خان صاحب غوری، رجسٹرار امتحانات عربی و فارسی اتر پردیش	۲۵-۸۵ ۱۶۵
۴	جناب مولانا قاضی اطہر صاحب مبارکپوری اڈیٹر البلاغ بمبئی	۱۱۵	۱۲	جناب سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب ایم اے	۱۳۹-۲۳۵
۵	جناب سید امین الحسینی صاحب حیدرآباد	۲۱۹	۱۳	جناب سید صدیق حسن صاحب مرحوم	۶۷
۶	جناب مولوی تقی الدین صاحب ندوی استاذ حدیث دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ	۵۶-۱۲۷ ۲۱۳	۱۴	جناب مولوی ضیاء الدین صاحب اصلاحی رفیق دار المصنفین	۴۰۸
۷	جناب جاوید انصاری برہانپور	۲۹۱	۱۵	جناب حافظ غلام مرتضیٰ صاحب ایم، اے استاذ شعبۂ عربی و فارسی الٰہ آباد یونیورسٹی	۴۶۴
۸	جناب مولانا حسین احمد صاحب مدنیؒ	۴۶۸			

فہرست مضامینِ معارف

جلد ۹۳

از جنوری ۱۹۶۴ء تا جون ۱۹۶۴ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

جلد ۹۳ - ماہ شعبان المعظم ۱۳۸۳ھ مطابق ماہ جنوری ۱۹۶۴ء - عدد ۱

مضامین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شذرات

اسلامی علوم، دینی تعلیم اور دین وملت کی خدمت کے کچھ اصول اور طریقے تو بنیادی حیثیت رکھتے ہیں جو ہمیشہ یکساں رہیں گے اور کچھ طریقے زمانہ کے حالات اور تقاضوں کے مطابق بدلتے رہتے ہیں، اس کے بغیر دین کی صحیح خدمت نہیں ہوسکتی، اسی اعتبار سے مسلمانوں کا نظام تعلیم ہر زمانہ میں بدلتا رہا اور اس کی ضرورت آج بھی ہے مگر مسلمانوں کے دور زوال میں ان کی دوسری چیزوں کی طرح ان کا نظام تعلیم بھی بے روح اور جامد ہو کر رہ گیا تھا، اس میں حالات کے مقابلہ کی طاقت نہ تھی، عین اسی زمانہ میں مغربی علوم اور مغربی تہذیب کی یلغار شروع ہوئی جس نے مسلمانوں کے مذہب ان کی تاریخ، ان کی تہذیب اور ان کی روایات وغیرہ پر مختلف سمتوں اور ایسے ایسے گوشوں سے حملہ شروع کر دیا، جس کے جواب سے ہمارے علما قاصر تھے، اس سے نہ صرف دوسری قوموں بلکہ خود مسلمانوں کی نئی نسل میں اسلام اور مسلمانوں کے متعلق طرح طرح کی غلط فہمیاں پھیلنے لگیں اور امت اسلامیہ کی پوری عمارت خطرہ میں پڑ گئی، اس صورت حال کے مقابلہ کے لیے ایسے نظام تعلیم کی ضرورت تھی جو قدیم وجدید دونوں ضروریات کا جامع ہو اور ایسے علما پیدا کر سکے جو دینی علوم میں مہارت اور دین میں رسوخ و پختگی، نئے خیالات و رجحانات اور مغرب کے حملوں کی کمین گاہوں سے پوری طرح واقف ہوں، تاکہ انہی کے اسلحہ سے انکا جواب دے سکیں، دار العلوم ندوۃ العلماء کے قیام کے مقاصد میں سب سے بڑا مقصد یہی تھا، اور اس کی حیثیت محض ایک درسگاہ کی نہیں بلکہ ایک مستقل تحریک کی تھی، یہ وقت کی ایسی ضرورت تھی کہ ہندوستان کے تمام عربی مدارس اس سے متاثر ہوئے اور دار العلوم ندوۃ العلماء اور اسکے علمی ثمر دار المصنفین نے ہندوستان میں علم اور تعلیم کی راہ سے دین کی خدمت کا ایک نیا مکتب فکر قائم کر دیا، اور آج مسلمانوں کے بہت سے علمی اور تعلیمی ادارے اسی راہ پر گامزن ہیں۔

یہ ضرورت جس قدر دار العلوم ندوۃ العلماء کے قیام کے زمانہ میں تھی اسی قدر آج بھی ہے، بلکہ نئے پیدا شدہ مسائل نئی مادی اور ملحدانہ تحریکوں اور ہندوستان کے موجودہ حالات نے اس ضرورت کو اور بڑھا دیا ہے، ندوہ آج بھی ان فرائض کو ادا کر رہا ہے، اس کی تعلیمی شہرت اتنی پھیل گئی ہے کہ یورپ کی بعض یونیورسٹیوں تک نے ڈاکٹریٹ کے داخلہ کے لیے اس کی سند کو تسلیم کر لیا ہے، اسلامی بلکہ خالص عرب ملکوں کے بہت سے طلبہ اس وقت ندوہ میں

زیر تعلیم ہیں، دار العلوم سے ایک پندرہ روزہ عربی اخبار "الرائد" اور ایک ماہانہ عربی رسالہ "البعث الاسلامی" نکل رہا ہے، جس کے علمی اور ادبی معیار کو عرب ادبا تک مانتے ہیں، یہ دونوں اخبار اور رسالے ہندوستانی مسلمانوں اور عرب ملکوں کے درمیان ربط وتعلق کا بڑا ذریعہ ہیں، علمی حیثیت سے دین کی خدمت کے لیے "مجلس تحقیقات ونشریات اسلام" کے نام سے ایک ادارہ قائم ہے، جو بڑی مفید خدمات انجام دے رہا ہے، اس کی بعض کتابوں کے عربی اور انگریزی ترجمے بھی ہو چکے ہیں، موجودہ زمانہ کے ان مسائل کے حل کے لیے جن کا زندگی کے کاروبار میں روزانہ سابقہ پڑتا ہے اور جن کا وجود پرانی فقہ میں نہیں ہے، "مجلس تحقیقات شرعیہ" کے نام سے حال میں ایک ادارہ قائم ہوا ہے، جو اس ضروری اور اہم کام کو ہندوستان کے اصحاب فقہ و فتاویٰ علماء کے مشورے سے انجام دے رہا ہے، دینی حیثیت سے ندوہ تبلیغی جماعت کا ایک اہم مرکز بن گیا ہے، اس کے ناظم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی دینی اور تبلیغی خدمات سے پورا ملک واقف ہے، غرض ندوہ ہر میدان میں علم ودین کی خدمت کا پورا فرض انجام دے رہا ہے، ابھی حال میں دار العلوم سے "تعمیر حیات" کے نام سے اردو کا بھی ایک پندرہ روزہ اخبار نکلا ہے، جو ندوے مقاصد کی اشاعت اور اس کی ترجمانی کے ساتھ مفید علمی و دینی مضامین بھی پیش کرتا ہے، اس کی خریداری ہم خرما وہم ثواب ہے، اس لیے ہم کو امید ہے کہ دینی ذوق خصوصاً دار العلوم ندوۃ العلماء سے دلچسپی رکھنے والے اصحاب اس کی خریداری اور توسیع اشاعت کی کوشش کریں گے، اس کی قیمت پانچ روپے ۲۵ نئے پیسے ہے۔

ہندوستان کی تمام زبانوں کے رسم الخط میں وحدت پیدا کرنے خصوصاً اردو کے لیے دیوناگری رسم الخط اختیار کر لینے کی اب تک جتنی آوازیں اٹھیں وہ چنداں قابل توجہ نہ تھیں، لیکن اب دو بڑی شخصیتوں پنڈت جواہر لال نہرو اور مسٹر چھاگلا نے بھی اسی قسم کا مشورہ دیا ہے، پنڈت جی کا مشورہ تو سب زبانوں کے لیے یکساں ہے، لیکن مسٹر چھاگلا نے خاص طور سے اردو کے رسم الخط کو دیوناگری بنا دینے مشورہ دیا ہے، ہم کو ان کے مشورے پر کوئی تعجب نہیں ہے، وہ اپنی سیکلرزم کے ثبوت میں اختلافی معاملات و مسائل میں ہمیشہ اسی قسم کے مشورے دیا کرتے ہیں، اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ان کو اردو سے کوئی لگاؤ نہیں ہے، وہ شاید انکو اردو بولنے کا بھی کم اتفاق ہوتا ہوگا، اردو لٹریچر سے ان کی واقفیت کا تو کوئی سوال ہی نہیں، اور وہ جس تہذیب اور جس ماحول کے آدمی ہیں، اس میں اردو کی اہمیت کا احساس بھی

نہیں ہو سکتا، اردو کی دو حیثیتیں ہیں، ایک لسانی و ادبی، دوسری تہذیبی، لسانی حیثیت سے وہ ہندو مسلمانوں کی مشترک زبان ہے، لیکن تہذیبی حیثیت سے مسلمانوں کو اس سے ایک جذباتی لگاؤ بھی ہے، اس لیے کہ ہندوستان کی تمام زبانوں میں تنہا اردو ہی ایسی زبان ہے، جس میں مسلمانوں کے تہذیبی اثرات بھی ہیں، ہندوستانی مسلمانوں کے مذہبی اور علمی لٹریچر کا بہت بڑا ذخیرہ اردو میں ہے، اور ان کے لیے اس کی وہی حیثیت ہے، جو اسلامی ملکوں کے مسلمانوں کے لیے عربی کی ہے، اگر اردو کا رسم الخط بدل دیا جائے تو یہ سارا ذخیرہ جو صدیوں کی محنت کا نتیجہ ہے، برباد ہو جائے گا اور مسلمان اس سے بالکل محروم ہو جائیں گے، کیونکہ پورے ذخیرہ کا دیوناگری رسم الخط میں منتقل کرنا ناممکن ہے، اس لیے وہ کسی حال میں بھی رسم الخط کی تبدیلی پر آمادہ نہیں ہو سکتے، بلکہ اردو کا کوئی ہوا خواہ بھی آمادہ نہ ہوگا، اگر مسٹر چھاگلا اردو رسم الخط کی اس اہمیت کو نہیں سمجھتے،

رسم الخط کی تبدیلی درحقیقت اردو زبان کی موت ہے، گو اب اردو اور ہندی دو مستقل زبانیں ہو گئی ہیں، اور ان کا اپنا لٹریچر ہے، لیکن درحقیقت ان دونوں میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے، اور رسم الخط اور الفاظ کے تھوڑے ردوبدل سے آسانی کے ساتھ وہ ایک دوسرے کا قالب اختیار کر سکتی ہیں، ان کی مستقل حیثیت زیادہ تر ان کے رسم الخط کی وجہ سے قائم ہے، اگر اردو کا رسم الخط دیوناگری کر دیا جائے تو ہندی کے اس بحران میں وہ بہت جلد ہندی کی شکل اختیار کر لے گی، اور اس کا وجود چند دنوں میں ختم ہو جائے گا، اس لیے اردو والوں کو اس نئی چال سے ہوشیار رہنا چاہیے، اردو رسم الخط کی سیاسی حیثیت بھی نظر انداز کرنے کے لائق نہیں ہے، وہ وسط ایشیا کے متعدد اسلامی ملکوں کا رسم الخط ہے، اس میں اور عربی رسم الخط میں برائے نام فرق ہے، بلکہ یہ دونوں ایک ہی رسم الخط کی مختلف شکلیں ہیں، ایک کا نام نسخ اور دوسرے کا نستعلیق ہے، اس لیے اردو رسم الخط تمام اسلامی ملکوں سے ربط و تعلق کا ذریعہ ہے، ان حالات میں کم سے کم اردو کی حد تک پنڈت جواہر لال نہرو کا مشورہ ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔

مقالات

انیس الحجاج

ہندوستان کا فارسی زبان کا پہلا نایاب سفرنامہ

از
شاہ معین الدین احمد ندوی

تمام تیموری شاہزادیاں تعلیم کے زیور سے آراستہ تھیں اور علم و ادب کا نہایت پاکیزہ مذاق رکھتی تھیں، ان میں زیب النساء خصوصیت کے ساتھ نہایت اعلیٰ تعلیم یافتہ اور علماء و اہل کمال کی بڑی قدردان و سرپرست تھی، اور بقول علامہ شبلی "زیب النساء کا دربار حقیقت میں ایک اکیڈمی (بیت العلوم) تھی، ہر فن کے علماء و فضلاء نوکر تھے، جو ہمیشہ تالیف و تصنیف میں مشغول رہتے تھے، یہ کتابیں عموماً اس کے نام سے موسوم ہوتی تھیں، یعنی ان کے نام کا پہلا جز زیب ہوتا ہے"۔ مآثر عالمگیری کا مصنف لکھتا ہے:۔

"و از تحصیل علوم عربی و فارسی بہرۂ تمام براندوختہ و از اقسام خطوط نستعلیق و نسخ و شکستہ نصیبۂ وافی حاصل کردہ و از بسکہ ہمت قدسی نہمت آن قدرشناس رتبۂ علم و ہنر بجمع کتب و تصنیف و تالیف مصروف بود عنان توجہ بر ترفیۂ حال ارباب فضل و کمال معطوف در سرکار علیہ کتاب خانہ گرد آمدہ بود کہ بنظر ہیچ کسے در نیامدہ باشد و بسیارے از علماء و فضلاء و صلحاء و شعراء

و منشیان بلاغت دثار و خوشنویسان سحر نگار، بایں ذریعہ کامیاب انفصال آں صدر آرائے عزت و جلال بودند[1]

انہی علماء میں ایک عالم ملا صفی الدین اردبیلی تھے، بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ زیب النساء کے استاد بھی تھے، لیکن کسی معتبر سند سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی، مگر اتنا مسلم ہے کہ وہ شاہزادی کے درباری متوسلین میں تھے، افسوس ہے کہ ان کے حالات تلاش کرنے کے باوجود کسی تاریخ و تذکرہ میں نہیں ملے، مآثر عالمگیری سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ وہ شاہزادی کے حکم سے کشمیر میں رہتے تھے، اور اس کے ایما پر انھوں نے امام رازی کی تفسیر کبیر کا فارسی ترجمہ زیب التفاسیر کے نام سے کیا تھا[2]، بعض اور کتابیں بھی لکھی تھیں[3]، زیب التفاسیر کئی جلدوں میں تھی، لیکن اب اسکے صرف چھٹے حصہ کا پتہ بعض کتب خانوں میں چلتا ہے،

ملا صفی الدین حج بیت اللہ اور زیارت مدینہ منورہ کے شرف سے بھی مشرف ہوئے تھے، اس کا سفرنامہ انھوں نے انیس الحجاج کے نام سے لکھا تھا، یہ سفرنامہ اس حیثیت سے بہت اہم ہے کہ ہندوستان میں فارسی زبان کا پہلا سفرنامہ ہے، اور اس میں وہ تمام معلومات ہیں جن سے واقفیت اس زمانہ کے بحری مسافروں کے لیے ضروری تھی، یہ سفرنامہ بہت نایاب ہے، ہندوستان کے کسی کتب خانہ میں اس کا سراغ نہیں ملتا، برٹش میوزیم کے کتب خانہ میں اس کا نسخہ موجود ہے، ریو کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ لکھنؤ کے شاہی توپ خانہ کے کتب خانے میں اس کا ایک نسخہ تھا جس کو الیٹ نے دیکھا تھا[4]، اس کا ایک نہایت قدیم خوشخط اور مصور نسخہ دار المصنفین میں موجود ہے، قیاس ہے کہ یہ تصنیف کے قریب ہی زمانہ کا نسخہ ہے،

یہ نسخہ ۳۰ × ۲۰ / ۴ کے پچپن صفحات پر مشتمل ہے، درمیان اور آخر کے چند صفحات غائب ہیں، لیکن ابواب

[1] مآثر عالمگیری ص ۵۳۹ [2] ایضاً [3] فہرست کتب خانہ برٹش میوزیم ج ۳ ص ۹۸۰

کی فہرست اور سفرنامہ کے مندرجہ ابواب سے ظاہر ہوتا ہے کہ صرف چند ہی صفحات نہیں ہیں، کاغذ دبیز بادامی، جدول مطلی اور خط نستعلیق ہے، ہر صفحہ میں ۲۳ سطریں ہیں، اور سفر کے مختلف مقامات و مناظر کی انیس تصویریں ہیں، بعض پورے صفحہ کی ہیں اور بعض نصف صفحہ کی، اور سب تصویریں بالکل تر و تازہ اور تیموری دور کی مصوری کا اچھا نمونہ ہیں، ان کے رنگ و روغن میں اب تک فرق نہیں آیا ہے، اسکی تفصیل مضمون کے آخر میں آئے گی،

سفرنامہ حسب ذیل ابواب پر مشتمل ہے:-

مقدمہ ۔ در ذکر مجملے از کیفیت سلوک فقیر و رفقاء، از بندر سورت بجدہ براہ دریا و ادراک موسم بلطف خدا،

طریق اول ۔ در بیان مراعات لوازم سفر بحر و متممات آں، مسلک اول در مقدمات رکوب سفینہ، مسلک دوم در تدبیر ماکول، مسلک سوم در تدبیر مشروبات، مسلک چہارم در تذکرۂ آداب سلوک با رفقاء و کلی بمکارم اخلاق با بیگانہ و آشنا، تتمہ در مطائبۂ چند، بسوق کلام و شکر بر نجات از مخاطرہ بحفظ حفیظ علام،

طریق دوم ۔ در ذکر آداب عمرہ و حج اسلام و طوف بیت الحرام و مشاعر عظام و کیفیت و کمیت بقاع متبرکۂ حرم خدا و خصوصیات داخلہ و خارجہ کعبہ معظمہ زادہا اللہ شرفاً، مسلک اول در آداب حج و فوائد مہمۂ آں، مسلک دوم در نقل بعضے از اوضاع کعبہ مشرفہ و مسجد الحرام وغیرہ بروجہے کہ فقیر خود دیدہ، مسلک سیوم در ذکر آنچہ دریں باب از تاریخ مکہ مبارکہ تالیف قطب الدین حیدر حنفی مکی انتخاب و ترجمہ نمودہ، مسلک چہارم در شرح آنچہ از مفرحۃ الانام دریں مقام انتخاب و ترجمہ نمودہ، تتمہ در مجملے از خصوصیات مشاعر متبرکہ و احوال قوافل بلاد اسلام و فرق مجتمعہ در بلد الحرام و شوکت حجاج و شکوہ قافلہ سالاران مصر و شام۔

طریق سوم در ذکر آداب زیارت مدینہ مشرفہ علی مشرفہا السلام و متمات آں، مسلک اول

در کیفیت حصول این شرف برائے این حقیر با موانع کثیرہ و موجبات تاخیر و ذکر بعضی از بقاع متبرکہ طیبہ، مسلک دوم در آداب دخول مدینہ مشرفہ و زیارت حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم و زیارت صدیق اکبر و فاروق اعظم رضی اللہ عنہما، مسلک سوم در مجملے از اوضاع حرم و بلدہ مکرم رسول محترم علیہ من السلام ما ہو اتم، مسلک چہارم در آسامی و خصوصیات منازل واقع فی ما بین الحرمین، تتمہ در نخبۂ از مشاہدات بندر جدہ و بندر مخا و تذکرۂ حمد و شکر لطف حق عز و علا بر نجات از مخاطرات دریا، تتمہ در اشارہ بہ نبذۂ از سوانح بعد از نزول از سفینہ و ترغیب بر اعزاز و اکرام فقرا و واردین از مکہ و مدینہ کہ در نظر سالکان طریق بحر اتم خیرات و اہم مبرات است۔"

ان ابواب میں جو بحثیں اور معلومات مناسک حج، حج و زیارت کے احکام، اس کے آداب، اور مکہ معظمہ و مدینہ طیبہ کے آثار و مشاہد وغیرہ سے متعلق ہیں، وہ ہر زمانہ میں یکساں رہے ہیں اور ان کے متعلق تفصیلی حالات و معلومات کتابوں میں موجود ہیں، جن سے اہل علم پوری طرح واقف ہیں، اس لیے ان کے تذکرے کی ضرورت نہیں، لیکن اس زمانہ کے بحری سفر کے متعلق جو دلچسپ معلومات، مفید ہدایات، مختلف ملکوں کے حاجیوں کی خصوصیات، مصر و شام کے قافلہ سالاروں، محمل مصری، اور شریف مکہ کے جلوسوں کے شکوہ و تجمل کے حالات اور اس قسم کے دوسرے دلچسپ واقعات و معلومات ہیں، وہ اس زمانہ کے لوگوں کے لیے بھی دلچسپ ہیں، اس لیے ان کا خلاصہ آیندہ صفحات میں پیش کیا جاتا ہے۔

دلی سے روانگی مصنف شاہزادی زیب النساء سے اجازت لینے کے بعد ۱۲ رجب ۱۰۸۰ھ کو دلی سے نکلے اور ۱۳ شعبان کو احمد آباد اور ۲۲ کو یہاں سے چل کر ۳ رمضان کو سورت پہنچے، رمضان کا مہینہ یہاں گذار کر ۱۵ شوال ۱۰۸۰ھ کو ایک جہاز پر جس کا نام "سلامت رس" تھا، سوار ہوئے، اس جہاز میں ۲۰۴ مسافر تھے، جن کا نام درج رجسٹر تھا، اور ۵۰ نامعلوم الاسم مسافروں نے خفیہ سفر کیا تھا۔[1]

بندرگاہ سورت اس زمانہ میں بندرگاہ سورت جس قدر معمور تھی، اس کا اندازہ اس بیان سے ہوگا:

"و در بندرگاہ مذکور در روز عزم بورا از سفائن تجار و معارف وسہ جہاز دیگر، دو دیٹ کہ عبارت از غراب کلاں و جہاز خرد است ہمہ مملو از زوار و تجار و مشحون با امتعہ و اقمشہ بیشمار و بضاعات بنہایت بسیار بعزم بندر جدہ مجتمع و تیار می نمودند۔"[2]

سورت سے روانگی یہ سب جہاز ایک دو دن کے فرق سے آگے پیچھے جدہ روانہ ہوئے، دو شبانہ یوم چلنے کے بعد باد مخالف چلنے لگی، جس سے معلم کو جہاز سیدھے رخ چلانے میں بڑی دشواری پیش آئی، اور اس کی رفتار سست رہی، پانچ دن کے بعد تین دن تک سمندر میں سخت طوفان برپا رہا، چوتھے دن صبح کو خدا خدا کرکے ختم ہوا اور مسافروں کی جان میں جان آئی، راستہ میں جو مختلف قسم کے بری و بحری مناظر اور زیر زمین پہاڑ آتے رہے، مصنف نے ان سب کا ذکر کیا ہے،

اس کے بعد سفرنامہ کا ایک ورق غائب ہے، جس سے بعد کے حالات کا پتہ نہیں چلتا، اور یہ نہیں معلوم ہوتا کہ کتنے دنوں میں سفر ختم ہوا، اور جہاز کس بندرگاہ پر ٹھہرا، بعد کے ورق سے اندازہ ہوتا ہے کہ جدہ کے علاوہ کسی دوسری بندرگاہ میں ٹھہرا تھا،[3] چنانچہ مصنف لکھتے ہیں:

مکہ کا ورود الغرض فقیر ایک جماعت کی رفاقت میں جو ستر آدمیوں پر مشتمل تھی، سعدیہ روانہ ہوا، یہاں سے کچھ لوگ جدہ روانہ ہوگئے، اور فقیر نے سعدیہ میں احرام باندھ کر مکہ کا رخ کیا، کچھ دور چل کر ذی الحجہ کا چاند دکھائی دیا، اور تین ذی الحجہ کو مکہ پہنچا، آٹھویں ترویہ کے دن عرفات روانہ ہوا، اور ۹ کو بخیر و خوبی حج سے فراغت ملی،

---

[1] انیس الحجاج ص ۷ [2] ایضاً [3] اس زمانہ میں مکہ کی بندرگاہ مخا تھی، غالباً یہیں جہاز ٹھہرا ہوگا۔

یہ تو حج کی مختصر روداد تھی، اب اس کی تفصیل اور اس سفر کے دلچسپ واقعات ملاحظہ ہوں،

مصنف نے بحری سفر کرنے والوں کے لیے بڑی مفید ہدایات تحریر کی ہیں، ان کا خلاصہ یہ ہے:۔

بحری سفر کے لیے ضروری ہدایات اور مفید مشورے

مسافر کو چاہیے کہ بندرگاہ جاکر خود جہاز کا معائنہ کرے، دوسرے کے بیان پر اعتماد نہ کرنا چاہیے، جو جہاز چھوٹا اور پرانا نہ ہو، اور اس کا رخ مرغ کے سینہ کے مشابہ ہو، اس کا طول اس کے عرض سے زیادہ ہو، اس کا عملہ متعدد اور کارپرداز ہو، اس کے آلات و اسلحہ مضبوط و مستحکم ہوں، اس کو سفر کے لیے انتخاب کرنا چاہیے، جہاں تک ممکن ہو عرشہ پر قیام نہ کیا جائے، اس لیے کہ اس میں حرکت کی زیادتی کی وجہ سے صفراوی مزاج والوں کو دوران سر، متلی، ضعف اور تغیر مزاج کی شکایت ہو جاتی ہے، جہاز کے درمیانی حصہ میں سب سے کم حرکت ہوتی ہے، اس لیے قیام کی سب سے مناسب جگہ یہی ہے، دوسری ضروری چیز جائے ضرور کا انتخاب ہے، اس کو قیام گاہ کے متصل ہونا چاہیے، جہاز کے لیے کم سے کم دو معلم استاد، چند سکانچی، جہاز ڈھونے والے اور ماہر و تجربہ کار اور چست و چالاک خلاصیوں کا ہونا ضروری ہے، اسی طریقہ سے جہاز کا ناخدا، ہوشمند، خلیق، مہربان اور ایسا منتظم ہونا چاہیے کہ جہاز کے عملہ کو قابو میں رکھ سکے، اور مسافر انکی ایذا رسانی سے محفوظ رہیں۔

باربرداری وغیرہ کے متعلق ہدایات

ناخدا کو جہاز کی باربرداری میں پوری ہوشیاری اور مہارت سے کام لینا چاہیے، بھاری سامان کو نیچے بار کرنا چاہیے، اور ہلکے اور مسافروں کے ضروری سامان کو اوپر رکھنا چاہیے، تاکہ جہاز دائیں بائیں زیادہ حرکت نہ کرے اور طوفان کے وقت خطرے سے کسی حد تک محفوظ رہے، اگر جہاز میں ایک معلم فرنگی اور ایک غیر معلم فرنگی ہو تو خدا کے کرم سے امید ہے کہ ضروری امور کی مراعات، اور جہاز کی رفتار اچھی رہے گی، کیونکہ فرنگیوں کو

دریانوردی اور جہاز کے نظم ونسق میں بڑی مہارت ہوتی ہے، جن مسافروں کے پاس ساز و سامان ہو ان کو اس کے لیے ایسی محفوظ جگہ انتخاب کرنا چاہیے کہ اٹھانے اور رکھنے میں خلاصیوں کی بے احتیاطی اور نمی پہنچنے کے نقصان سے محفوظ رہے،

ایسے جہاز میں سفر کرنا چاہیے جس کا ناخدا دنی الطبع، لالچی اور حریص نہ ہو اور اپنے فائدے کے لیے حد سے زیادہ سامان جہاز پر بار نہ کرے، اس سے مسافر خطرے میں پڑ جاتے ہیں، جہاز پر ناخدا کا اپنے اہل وعیال کو ساتھ رکھنا بہت بڑی غلطی ہے، جس کی تلافی نہیں ہوسکتی، ایسی صورت میں اگر جہاز کسی خطرہ میں گھر جائے تو ناخدا اتنا سراسیمہ اور بدحواس ہو جاتا ہے کہ تدارک کی صحیح تدبیر نہیں کرسکتا۔

متفرق ضروری مشورے

جہاز میں مناسب جگہ حاصل کرلینے کے بعد مسافر کو حتی الامکان کم حرکت کرنا چاہیے تاکہ ضعف اور دوران سر میں زیادتی نہ ہو، اگر صفرا کی وجہ سے دوران سر اور استفراغ ہو تو ترش چیزیں مثلاً رب انار، زرشک، لیمو، سرکہ اور انار دانہ وغیرہ استعمال کرنا چاہیے، اور خلوے معدہ اور شکم سیری دونوں سے بچنا چاہیے، ان سے شکایت اور بڑھتی ہے، اور اگر بلغمی مادہ کی وجہ سے دوران سر اور استفراغ ہو تو میٹھی چیزیں، شہد، نبات، قند اور خرما وغیرہ استعمال کرنا چاہیے، سوداوی اور دموی مزاج کے لوگ عموماً ان شکایتوں سے محفوظ رہتے ہیں،

جہاز میں آگ سے احتیاط اور ادنیٰ درجہ کے لوگوں کو تمباکو نوشی سے روکنا ضروری ہے، جہاز کے سفر میں مختلف طبقوں اور مختلف مزاج کے مسافر ہوتے ہیں، اور جدہ و مخا جانے والے جہازوں میں عموماً جگہ کی تنگی رہتی ہے، لوگوں میں ضبط و تحمل کا مادہ کم ہوتا ہے، اس لیے لڑائی جھگڑے کے اسباب کو روکنا اور ان کو خوش اسلوبی سے طے کرنا ضروری ہے، جہاں تک ممکن ہو کھانے پینے کی چیزوں سے رفقائے سفر کی تواضع کی جائے، ہر سفر خصوصاً مکہ کے بحری سفر میں آرام و

سہولت اسی میں ہے کہ کم سے کم سامان ساتھ رکھا جائے اور کھانے پینے کی چیزوں میں فیاضی سے کام لیا جائے، مکہ کے سفر میں جس قدر بھی فیاضی کی جائے اسراف میں داخل نہیں ہے، خصوصاً فقرا و مساکین اور ناتوانوں کو اپنی ذات پر ترجیح دینا چاہیے، سفر حج میں مختلف قسم کی دواؤں کا ساتھ رکھنا، جہاز میں طبیب، فصاد، بڑھئی، لوہار، بندوقچی اور توپچی کا ہونا ضروری ہے، تقویت دماغ اور دفع عفونت کے لیے عطریات خصوصاً گلاب، عرق بید مشک کا ساتھ رکھنا مفید ہے، اس سے نہ صرف صحت کا تحفظ بلکہ بہت سے امراض کا علاج بھی ہوجاتا ہے۔

خورد و نوش کا ضروری سامان کھانے کی چیزوں میں اتنا آٹا، چاول، چنا، ماش اور مسور کی دال، شکر ساتھ لیجانا ضروری ہے جو واپسی تک کے لیے کافی ہو سکے، کیونکہ حج کے موسم میں آدمیوں کی کثرت کی وجہ سے مکہ اور مدینہ میں عموماً غلہ گراں ہو جاتا ہے، اگر جہاز میں مرغ کا گوشت اور بکری وغیرہ ساتھ لیجائے تو اس کی نگہداشت خود کرنا چاہیے، یا کسی معتبر ملازم کے حوالہ کر دینا چاہیے، جو پوری دیکھ بھال کر سکے، اگر انڈا ساتھ لیجائے تو اس کو پسے ہوئے نمک میں رکھنا چاہیے، اس سے خراب نہ ہوں گے، قورمہ اور قیمہ ایسا ساتھ لیجانا چاہیے جو خوب مرغن اور بھنا ہوا ہو، تاکہ کچھ دنوں تک خراب نہ ہو سکے، اسی طریقہ سے اگر مختلف قسم کی روٹیاں ساتھ لے جانا چاہے تو نان تنک، نان دو آتشہ، آبی، روغنی، زنجبیلی، شکری روغنی، ختائی، قتلمہ، شکر میں پروردہ کلچے، ساق عروس اور سنبوسے لیجانا بہتر ہے، ان سے کھانے پینے کی لذت بھی دوبالا ہو جائے گی اور کچھ دنوں تک ٹھہر بھی سکیں گے، یہ شہرت غلط ہے کہ بحری ہوا میں مٹھائی اور روغن مرغوب نہیں ہوتا، بلکہ صفراوی مزاج والے کو بحری سفر میں مٹھائی مفید ہوتی ہے، اس لیے مٹھائیوں میں شکر پارے، نیم شکری، بادام، پستے، اور دوسرے مغزیات کا حلوا، سیب، بہی، انناس، لیموں، زرشک اور صندل کا مربہ جہاں تک ممکن ہو ساتھ لیجانا چاہیے، یہ چیزیں صحت اور قوت کے لیے بھی مفید ہیں اور ان سے آرام بھی ملے گا،

جو لوگ یہ چیزیں نہ لیجا سکیں، ان کو کم سے کم کشمش، بادام، منقی خرما وغیرہ خشک میوے ضرور ساتھ لیجانا چاہیے،

یہ ماکولات کی مختصر فہرست ہے، ورنہ مصنف نے پورے دو صفحوں میں ان کے انواع و اقسام لکھے ہیں، اس سے اس زمانہ کے تکلفات کا اندازہ ہوتا ہے،

آج بھی جبکہ سفر میں ہر طرح کی سہولتیں مہیا ہیں سفر کی تکلیفوں، طبیعت کے چڑچڑے پن، مختلف طبقوں اور مختلف مزاج کے انسانوں کے اجتماع اور جگہ کی تنگی کی وجہ سے حاجیوں میں بڑے جھگڑے اور اختلافات پیش آتے ہیں، اور بڑی پرانی پرانی دوستیاں ختم ہو جاتی ہیں، اس زمانہ میں جبکہ سفر کی یہ آسانیاں نہ تھیں اور بھی اختلافات اور جھگڑے پیش آتے رہے ہوں گے اس لیے مصنف نے رفع نزاع پر ایک مستقل باب لکھا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے،

جھگڑے اور اختلافات سے بچنے کی ہدایات اور حسن اخلاق کی تعلیم

فضائل اخلاق سے آراستگی، رذائل کا ترک، حسن اخلاق، خوش خوئی، نفس کشی، غیظ و غضب کا ضبط، ناپسندیدہ باتوں سے چشم پوشی، ناخوشگوار امور پر صبر، تکلیف دہ باتوں کا تحمل، ہر حالت میں حسن معاشرت، بقائے محبت اور راحت و سکون کا ذریعہ، سرور و شادمانی کا سرمایہ اور زندگی بسر کرنے کا سب سے بہتر طریقہ ہے، لیکن جہاز کے سفر میں طبیعت کے چڑچڑے پن، سفر کے شدائد اور دوسرے مکروہات کی بنا پر مذکورۂ بالا اصولوں کی رعایت میں کوتاہی ہو جاتی ہے، عرصہ تک مسافروں کے ساتھ یکجائی، ہر وقت کے ساتھ، ان کے اقوال و افعال کے مشاہدہ اور تجربے، مختلف طبقوں، مختلف مزاج، اور مختلف مرتبہ کے لوگوں کے ساتھ سابقہ اور میل جول کی بنا پر ان سے بحث و تکرار اور سوال و جواب کے مواقع زیادہ پیش آتے ہیں، اور کتابوں اور تاریخ کے مطالعے اور عمدہ اور اخلاقی حکایتوں کے سننے کا موقع نہیں ملتا، جس سے آدمی کم حوصلہ، تند خو اور نازک مزاج ہو جاتا ہے، اس لیے عقلمند آدمی کو چاہیے کہ مختلف فیہ امور، اختلافی معاملات اور نزاعی مسائل میں اپنے ہی کو حق پر نہ سمجھے،

بلکہ خطا کار شمار کرے، تحمل و بردباری اور وقار و کم آزاری کو شعار بنائے، بشاشت اور شگفتہ مزاجی کے ساتھ رفقاء کی دلجوئی کرے، اور کھانے پینے کی چیزوں خصوصاً پانی کے معاملہ میں ایثار اور فیاضی سے کام لے، جہاں تک ممکن ہو ہر کس و ناکس خصوصاً غمزدوں کی غمخواری و دلداری کرتا رہے، اگر کوئی حادثہ یا خطرہ پیش آجائے تو دل مضبوط رکھے، پست ہمتوں کی طرح خوفزدہ کرنے والی باتیں زبان پر نہ لائے، لوگوں کو تسکین و تسلی دینے کی کوشش کرے، اگر دشمنوں کا مقابلہ ہو جائے یا جہاز میں رخنہ پڑ جائے، اس میں پانی بھرنے لگے یا اس قسم کے اور جو خطرات پیش آئیں ان کے مقابلہ اور تدارک کی پوری کوشش کرے، اس سے لوگوں میں یقین و اعتماد اور استقلال پیدا ہوگا، اگر اس کے بعد بھی تدارک میں ناکامی ہو تو کم سے کم ضمیر مطمئن رہے گا کہ اپنے فرض کی ادائیگی میں کوتاہی نہیں ہوئی،

مذہبی اور اخلاقی کتابوں کا مطالعہ

جہاز میں جہاں تک ممکن ہو، دماغی قوت قائم رکھنے کے لیے ضعف و کمزوری پیدا کرنے والی حرکات سے اجتناب اور مقویات کا استعمال کرتا اور لطف و تفریح کی حکایات سے رفقائے سفر کا دل بہلاتا رہے، منہیات و معاصی اور ان تمام چیزوں سے جو لطف الٰہی سے دوری کا سبب ہیں، احتراز ضروری ہے، ہمیشہ خدا کے فضل و کرم سے متوسل رہے، تاکہ اسکی توفیق سے حصول مقصد میں کامیابی ہو، دوران سفر میں اخلاقی کتابوں، خصوصاً احیاء العلوم، سیرۃ النبی، تواریخ و اخلاق کے مشہور رسائل، جامع الحکایات یمبذی اور فرج بعد الشدۃ قاضی تنوخی اور اس قبیل کی دوسری کتابوں کا پڑھنا اور سننا بہت مفید ہے،

اس سفرنامہ کا ایک دلچسپ حصہ مختلف اسلامی ملکوں کے باشندوں کے اوصاف و خصوصیات ہیں جو دوسرے سفرناموں میں بہت کم ملتے ہیں، اس لیے ناظرین اس کو دلچسپی سے پڑھیں گے،

مختلف ملکوں کے حاجیوں کے اوصاف و خصوصیات

حاجیوں میں ایک بڑی جماعت ایسی تھی جس کی وضع قطع خاص قسم کی تھی، اور ٹوٹی شکستہ عربی بولتی تھی، یہ سب بڑے جھگڑالو، غصہ ور اور مراسم انسانیت

سے عاری تھے، ان کے اوقات کا بیشتر حصہ دنیاوی امور کی مشغولیت اور ساز و سامان کی خریداری میں گذرتا تھا، ان کے بیشتر افعال مکر و فریب پر مبنی تھے، یہ مغاربہ کہلاتے تھے، لیکن ان کو جسم و لباس کی صفائی، چہرے مہرے کی خوشنمائی وغیرہ میں انکو مغربی ملکوں کی خصوصیات سے بہت کم حصہ ملا تھا، بلکہ مغاربہ کے اوصاف و محاسن کے برعکس باتیں نظر آتی تھیں۔

مصر کے قافلہ میں بیس ہزار آدمی نظر آتے تھے جن کی بڑی تعداد فوجیوں اور افسروں پر مشتمل تھی، وہ آپس میں تو ایک دوسرے کی ہمدردی اور امداد و اعانت سے کام لیتے تھے، لیکن عربوں کے مقابلہ میں اپنا تفوق دکھاتے اور چھوٹے چھوٹے معاملات میں بھی سختی و درشتی اور شہ زوری سے کام لیتے تھے، ترکی اور مصری عربی یعنی غلط سلط عامیانہ زبان بولتے تھے، جو تہامہ اور حجاز کے اعلیٰ طبقہ کی زبان سے بالکل مختلف اور بڑی ناہموار، پست اور ادنی درجہ کی زبان تھی، لیکن انکے اونچے طبقے خصوصاً اس کے طلبہ کی زبان اور ان کے محاورے اہل حجاز کی زبان سے قریب تر تھے، حقیر کو آفندیان مصر میں دو آدمیوں سے باتیں کرنے کا اتفاق ہوا، ان کی زبان عربیت اور نحو کے اعتبار سے حرمین کے باشندوں سے بھی زیادہ صحیح تھی، اہل تہامہ کی فصاحت و بلاغت کے متعلق کتابوں میں بہت پڑھا تھا، اور اس کے شواہد بھی موجود ہیں، لیکن جہاں تک الفاظ کی صحت، حروف کے صحت مخارج اور عربی اسلوب کا تعلق ہے، مصر کے طلبہ بہت صحیح عربی بولتے ہیں، لیکن مصریوں میں مکر و فریب، جھوٹ، فتنہ و فساد و ابتذال و سفاہت اور نفاق اتنا عام ہے، جس کی نظیر دوسرے ملکوں میں نہیں مل سکتی۔

مصر کے قافلہ میں زیادہ تر ترک منش اور تاجیک روش فوجی، عام رعیت اور ادنی طبقہ کے لوگ تھے، جو اپنے عادات و خصائل میں ہندوستان کے کشمیریوں سے بھی بازی لے گئے تھے،

شام کے حجاج خواہ وہ فوجی ہوں یا عام رعیت، شام کی آب و ہوا کی طرح جسکی خوبی و لطافت

مشہور ہے، خوبصورت، خوش وضع اور خوش اخلاق ہیں، اور دوسرے اوصاف و محاسن میں اگر وہ "نیکان سائرا حنات" سے بڑھکر نہیں تو کسی سے کم بھی نہیں ہیں، اور عقل و دانش، وضع قطع اور اخلاق و عادات میں دوسرے ملکوں کے قافلہ کے لوگوں میں جو فرق نظر آتا ہے وہ ان میں کم ہے، ان کے رنگ کی صباحت، بیان کی ملاحت و اعضاء کے تناسب اور وضع و ہیئت کی خوبی دیکھکر لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم کا نمونہ اور ان کے پسندیدہ عادات و خصائل میں قد افلح من زکّٰها کا منظر نظر آتا ہے، اور قد خاب من دسّٰها کا مصداق مصری ہیں جس کے بہت سے شواہد پیش کیے جاسکتے ہیں۔

ایک معتبر اور قابل اعتماد شخص سے سننے میں آیا کہ اب سے چند سال پیشتر ایک دن مصر کے ایک ممتاز شیخ جو بڑے صاحب اقتدار تھے اور جن کے پیرووں کی بڑی تعداد تھی، مسعیٰ سے گذر رہے تھے کہ ان کی نظر مسجد حرام کے پھاٹک سے حرم کے صحن پر پڑی، اس کی وسعت، کشادگی اور روح افزا منظر کو دیکھکر اپنے رفقاء سے کہنے لگے کہ اندرون شہر ایسی وسیع اور ہموار جگہ کو چھوڑکر جو اونٹ باندھنے کے لیے نہایت موزوں ہے، تم لوگ اپنے اونٹ ایک تنگ اور گنجان جگہ میں باندھ کر خواہ مخواہ کی پریشانی اٹھا رہے ہو، یہ سنکر ایک شخص نے کہا یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں، یہ تو مسجد حرام اور اہل اسلام کی عبادت گاہ ہے، اس کے وسط میں کعبہ معظمہ، خانہ خدا اور مسلمانوں کا مطاف ہے، یہ کیسی لغویات آپ نے زبان سے نکالی، کیا آپ کو اس کا علم نہیں ہے، "صاحب معرفت شیخ" نے غصہ میں جواب دیا :۔

واللہ جئت اثنتین وعشرین — خدا کی قسم میں بائیس مرتبہ اس شہر میں آیا اور حج بھی

مرةً الی هذا البلد وحکیت (حججت) — کیا مگر یہ جگہ اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی،

ومارأیت هذا المکان وما عرفت انقو ل — اس لیے تمہارا کہنا میری سمجھ میں نہیں آیا۔

اسی طرح ایک اور واقعہ ایک متقی بزرگ سے سننے میں آیا، ان کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ ایک مصری سے جو کئی مرتبہ حج اور تجارت کے لیے مکہ آچکا تھا، واپسی میں کسی نے پوچھا کہ آپ کئی حج کر چکے ہیں، آپ کو حرم کے کون کون سے مقام یاد ہیں، اس "واہی واقف کار" نے چند نام بتلائے سائل نے عربی میں پوچھا کہ آپ نے زمزم کو بھی دیکھا، اس نے جواب دیا،

(ای وا) کان رجل یبیع الکحل — ہاں یہ شخص باب السلام پر سرمہ بیچا کرتا

فی باب السلام — تھا۔

حاضرین نے کہا کیا خوب، زمزم تو ایک کنواں ہے جس کا پانی پیا جاتا ہے، "عارف کامل" نے جواب دیا

واللہ حکیت (حججت) خمسة وعشرین — خدا کی قسم میں نے پچیس مرتبہ حج کیا اور

مرتبة وماشفت البیر لعله — کنواں میں نے نہیں دیکھا، غالباً اس کے

حفر (حضر) ما خرجت — بعد کھودا گیا۔

اعراب بادیہ کا قافلہ دس ہزار نفوس پر مشتمل تھا، جو ایک خاص امتیازی لباس میں نظر آتا تھا، اس کی ہر چیز کو دیکھکر سخت تعجب ہوتا تھا کہ ان کو لوگ کیا سمجھتے ہیں اور کیا نکلے،

ہندی قافلہ، ہندی، تورانی، ایرانی مختلف رنگ و نسل کے لوگوں پر مشتمل تھا، اور اپنے اوضاع و اطوار میں نمایاں اور ممتاز تھا، اور حاجی نما خلاصیوں کی کثرت، تہی مغز زائروں کے اژدحام اور فقراء کے ہجوم میں اس کے مختصر معتدل آدمی اور بھی ممتاز نظر آتے تھے۔

ایران کا قافلہ جس کا بڑا حصہ دریائے کنگ اور دریائے کنار کے راستہ سے اور کچھ لوگ بغداد اور نجف کی راہ سے آئے تھے، اپنے لباس، وضع قطع اور معاشرت میں انتہائی افلاس زدہ تھے، لیکن عربوں اور ترکوں کی ایذارسانی کے خوف سے اس حالت میں رہنے پر مجبور تھے، اگر ایسا نہ کریں تو ان کا آنا ناممکن ہے، اور ان کی جان خطرہ میں پڑ جائے۔

یمن کے قافلہ میں چند فلاکت زدہ مدینہ منورہ کے زائرین کے ہجوم کے ہمرکاب تھے اور دوسرے قافلے والوں کے مقابلہ میں ان کی کوئی حیثیت نہیں معلوم ہوتی تھی،

شریف برکات کی سواری کا جلوس

غرۂ ذی الحجہ کے بعد اور یوم ترویہ سے قبل ۷ ذی الحجہ کو بڑے شکوہ و تجمل کے ساتھ شریف برکات کی سواری نکلی، ان کے جلوس میں سات سو پیادہ اور پانسو سوار، عرب حبشی اور ترکی فوج تھی، مختلف قسم کے ترکی باجے آگے آگے بجتے جاتے تھے، ایک چتر بردار شریف کے سر پر ایک مکلف چتر لگائے ہوئے تھا اور ایک لونڈی خوشبو کے لیے عود کی انگیٹھی اور دوسری عود کی سینی سر پر رکھے آگے آگے چل رہی تھی، یہ جلوس تنعیم کی راہ سے مکہ کے باہر مصر کے ایک بڑے عہدہ دار اور امیر الحاج عبدی پاشاہ کی فرودگاہ پر پہنچا جو مصر سے شریف مکہ کے لیے خلعت لائے تھے، شریف برکات یہ خلعت پہنکر دو گھنٹے کے بعد اسی راہ سے مکہ واپس آئے، یہ خلعت زربفت کے عربی چغے اور زری کی خفتان پر مشتمل تھی، شریف کے گھر واپس آنے کے بعد سات سو بندوقوں کی سلامی دی گئی، ۷ ذی الحجہ کو اسی شان اور اسی راستہ سے شریف کا دوسرا جلوس نکلا، اور اسی جگہ شام کے امیر الحاج احمد پاشا کا خلعت پہنکر واپس آیا۔

امیر الحاج مصر اور محمل مصری کا جلوس

۲۵ پچیسویں ذی الحجہ کو مصر کا قافلہ مکہ سے باہر چلا گیا، اور اس کے امیر الحاج جو ایک خوش جمال اور سفید ریش بزرگ تھے، شریف مکہ سے رخصت ہوکر اور ان کا خلعت پہنکر مصری فوج و سپاہ کے ساتھ اسی راہ سے گذرے، محمل مصری جو سیاہ اطلس سے ڈھکا ہوا، اور سنہرے قبوں سے آراستہ تھا، رنگا رنگ علموں کے جھرمٹ میں بڑے شکوہ و تجمل کے ساتھ تنعیم کے راستہ سے مدینہ منورہ روانہ ہوا، امیر الحاج فوجی دستہ کے ساتھ اس کے عقب میں تھے، ان کے پیچھے علم بیرقین اور مختلف قسم کے باجے اور ساز تھے، تقریباً دو ہزار سوار اور تین ہزار پیادہ سپاہ پر یہ جلوس مشتمل تھا، اور بے شمار اونٹوں پر مختلف قسم کا

ساز و سامان بار تھا، اور دو دو آراستہ اور پیراستہ اونٹوں کے درمیان پُر تکلف تخت رواں تھا،

امیر الحاج شام کی سواری کا جلوس

۲ محرم کو امیر الحاج شام اسی طریقہ سے شریف مکہ سے رخصت ہوکر پورے شکوہ و تجمل کے ساتھ اسی راستہ سے مدینہ منورہ روانہ ہوئے، ان کا جلوس شان و شوکت، شکوہ و تجمل، جھنڈون، بیرقون، سوار و پیادہ مسلح فوج، اونٹوں کی قطار اور تخت رواں کی کثرت کے لحاظ سے امیر الحاج مصر کے جلوس سے بھی زیادہ شاندار تھا، ان کو رخصت کرنے کے لیے خود شریف مکہ کے لڑکے سوار و پیادہ فوج اور اشراف و عمائد مکہ کے ساتھ آئے تھے، اور مکہ سے باہر تک انکی مشایعت کی۔

منی اور مکہ کے چراغاں

مکہ سے ان قافلوں کی روانگی ایک بڑی تقریب معلوم ہوتی تھی، لیکن ان دونوں قافلوں نے گیارہویں اور بارہویں ذی الحجہ کی شب کو منی میں جو چراغاں کیے تھے، اور ربیع الاول میں مولد مبارک کی شب کو مکہ کے عظماء و اکابر نے جو روشنی کی تھی وہ اس حقیر اور ان لوگوں کی نگاہ میں جنھوں نے اعلیٰ حضرت صاحبقران ثانی (شاہجہاں) اور اعلیٰ حضرت ظل سبحانی (اورنگ زیب) کے جشن جلوس کا چراغاں اور جمنا میں کشتیوں کی آرایش اور ان کا اجتماع دیکھا ہے نہیں جنچی،

چھیانوے مثقال کا الماس

۱۰۸۶ھ کا ایک قابل ذکر واقعہ معتبر آدمیوں سے یہ سننے میں آیا کہ ولایت سنار (زنجبار) کے بادشاہ سلطان باری بن سلطان رباطا نے جو ایک دیندار بادشاہ ہے، اپنے پڑوس کے ایک کافر بادشاہ پر حملہ کرکے اس کو شکست دی، مال غنیمت میں منجملہ اور چیزوں کے چھیانوے مثقال کا ایک سالم اور بے عیب الماس بھی ہاتھ آیا، اس کو اس نے روضۂ نبوی کی نذر کردیا،

اندرون خانہ کعبہ کی زیارت

عاشورہ کے دن خانہ کعبہ کا دروازہ کھولا گیا اور لوگوں کو بار عام کی

اجازت دی گئی، اس وقت ہندوستان اور ایران کے جو حاجی رہ گئے تھے وہ من دخلہ آمنا کے شرف سے مشرف ہوئے، اس حقیر کو بھی یہ شرف حاصل ہوا، اور چند رکعت نماز ماثورہ پڑھکر اندرونِ کعبہ کی ان خصوصیات کا آنکھوں سے مشاہدہ کیا، جن کو رسالہ مفرح القلوب[1] میں پڑھا تھا، الحمد للہ کثیرا کما ھو اھلہ و مستحقہ علی نیل السعادات الکاملۃ فی ھذہ السنۃ سیما ھذہ المنحۃ الکبری والعطیۃ العظمی حسن اتفاق سے اس سال عرفہ جمعہ کو پڑا تھا اس لیے بقول اکثر خصوصاً بلد الحرام کے باشندوں کی اصطلاح میں حج اکبر کی سعادت حاصل ہوئی،

زیارت مدینہ طیبہ

۲۳ محرم کو مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ روانہ ہوئے، اور آٹھویں صفر کو مدینہ پہنچے، اور روضہ اطہر صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کے بعد آسودگان جنۃ البقیع کے مزارات اور دوسرے آثار و مشاہد مقدسہ کی زیارت کے شرف سے مشرف ہوئے، مدینہ میں بہت کم قیام کا موقع ملا، آٹھویں ماہ صفر کو مدینہ پہنچے اور اکیسویں صفر کو پھر مکہ واپس آگئے، اس لیے یہاں کے واقعات میں آدابِ زیارت وغیرہ کے علاوہ اور کوئی واقعہ قابل ذکر نہیں ہے۔

مکہ اور مدینہ کی درمیانی منزلیں

اس زمانہ میں مکہ اور مدینہ کے درمیان حسب ذیل منزلیں تھیں، وادی فاطمہؓ، یہ ایک نہایت دلکشا مقام ہے، اس میں شیریں اور خوش ذائقہ پانی کی قناتی نہر جاری ہے، اور سرسبز و شاداب نخلستان ہیں، قدیدہ، یہ ایک بے آب و گیاہ میدان ہے، یہاں پانی وادی سے لاتے ہیں، اور قافلہ کی فرودگاہ پر ایک سبیل بھی رہتی ہے، جو شریف محسن کی سبیل کے نام سے موسوم ہے، عسفان یہاں دو کنوئیں ہیں، ایک کنوئیں کا پانی بہت شیریں اور لطیف ہے، خلیص یہاں پانی کی ایک نہر ہے، اور قریب ہی ایک تالاب پر نخلستان بھی ہے، خبط مجنوں، یہ ایک بے آب و گیاہ دشت ہے، لیکن بڑا دلکشا مقام ہے، رابغ، یہاں بازار، نخلستان اور دو کنوئیں ہیں، مستورہ

[1] تالیف سید زین العابدین کاشی مجاور مکہ معظمہ

یہ بھی بے آب و گیاہ دشت ہے، اور یہاں صرف کھاری پانی کا ایک کنواں ہے، اس کے متصل ایک تربے نامور سید یحییٰ کا مزار ہے، بیرہن یہاں ایک کنواں ہے جس کا پانی عربوں کے بیے اونٹ کے دودھ سے زیادہ لذیذ اور نفع بخش ہے، صفراء، یہاں آب جاری کی دو نہریں ہیں اور نخلستان بھی ہیں، بڑا دلکش اور فرحت افزا مقام ہے، یہاں کی کھجوریں، لیموں اور نارنج بہت مشہور ہیں، یہیں مشہور صحابی حضرت ابوذر غفاریؓ کا مزار ہے، روحاء، یہاں پانی کا ایک کنواں اور چند تالاب ہیں، حضرت ابو عبیدہؓ[1] ابن عم رسولؐ کا مزار بھی یہیں ہے،

اس کے علاوہ بدر کی راہ سے مدینہ منورہ کا ایک اور راستہ بھی ہے، یہ راستہ مستورہ کی منزل سے جدا ہو جاتا ہے، اور یہاں سے داہنی جانب سمندر کی سمت سے ہو کر جاتا ہے، اس کے مغربی جانب سمندر کا فاصلہ دو شبانہ یوم کا ہے، اس راستہ میں مدینہ سے ینبع جاتے ہیں، پھر بدر کے راستہ سے صفرا ہوتے ہوئے سفر کرتے ہیں،

اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کا ایک عجیب واقعہ

اس مقدس سفر میں اس حقیر اور اس کے رفقاء کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے جو الطاف و عنایات ظاہر ہوئے ان میں سے ایک قابل ذکر واقعہ یہ ہے کہ مدینہ منورہ کی زیارت سے شرف اندوزی اور مکہ مکرمہ سے واپسی کے بعد جب وطن کی مراجعت کا وقت آیا تو اس بارہ میں بڑا تذبذب پیدا ہوا کہ اسی جہاز پر سفر کیا جائے جس پر آنا ہوا تھا یا دوسرے جہاز پر جس کا نام فتحی تھا، اور اس کا مالک ایک بغدادی محمد چلپی تھا، یہ جہاز پہلے جہاز "سلامت رس" سے ہر حیثیت سے بہتر تھا اس لیے میں اسی پر جانا چاہتا تھا، چنانچہ ایک عزیز کے ذریعہ اس کے حالات کی تحقیقات کی، انھوں نے بھی تائید کی، اسی دوران میں معلوم ہوا کہ جہاز کے مالک محمد چلپی نے جہاز ایک افغانی کے ہاتھ بیچ دیا ہے، اس نے بھی اس حقیر کو خط لکھا اور اپنے جہاز پر سفر کرنے کی ترغیب دی، لیکن اس سے پھر طبیعت میں تذبذب پیدا ہو گیا،

[1] معارف: معلوم نہیں اس سے کون ابو عبیدہ مراد ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی چچازاد بھائی کا نام ابو عبیدہ نہیں تھا اور مشہور صحابی ابو عبیدہؓ بن الجراح کی وفات طاعون عمواس میں ہوئی تھی اور ان کا مزار شام میں ہے،

اتفاق سے اسی درمیان میں ایک شخص تفسیر جلالین کا ایک نسخہ ہدیہ کرنے کے لیے لایا، اور مجھکو دیکھنے کے لیے دیا، میں نے بغیر کسی اہتمام کے جہاز سلامت رس پر سفر کرنے کے لیے فال نکالی، تو یہ آیت نکلی "اولئک الذین هدى الله فبهداهم اقتده" اس فال پر میں نے اس جہاز پر سفر کرنے کا فیصلہ کرلیا، مگر فتحی پر سفر کے لیے بھی دوبارہ تفاول کیا، تو یہ آیت نکلی "فکان من المغرقین" اس جہاز پر آٹھ سو سے زیادہ حاجی سفر کرنے والے تھے، اس لیے اس فال سے بڑی پریشانی ہوئی، لیکن اس کے اظہار سے مسافروں میں پریشانی اور ان کے سفر میں خلل پڑنے کا اندیشہ تھا، اس لیے دوسرے تفاول کو سفر کے شدائد اور تکلیفوں پر محمول اور خدا کے لطف و کرم پر بھروسہ کرکے اس کو کسی پر ظاہر نہیں کیا، لیکن بعض لوگوں کو معلوم ہوگیا، ان سے فتحی جہاز کے مسافروں کو بھی اس کی خبر پہنچ گئی، مگر اس کو انھوں نے فتحی جہاز سے میری ناراضگی پر محمول کیا اور اپنا ارادہ فسخ نہیں کیا، اور میں نے سلامت رس کا سفر اختیار کیا، اور ۲۵ روز میں بخیریت سورت پہنچ گیا، اس کے بعد دوسرے جہازوں کی آمد شروع ہوئی، فتحی جہاز کو بھی راستہ میں کوئی حادثہ پیش نہیں آیا، لیکن بندر سورت پہنچنے کے بعد لنگر گاہ کے قریب کسی حادثہ سے ٹوٹ گیا، مسافروں کا سارا سامان تلف ہوگیا لیکن مسافر کسی نہ کسی طرح بہزار دقت بچ گئے اور کوئی جان ضائع نہیں ہوئی،

تصویریں سفرنامے کی تصویروں کی تفصیل حسب ذیل ہے:-

پہلی تصویر- "نمونہ بندر سورت و جہاز ہوری" پورے صفحہ کی ہے،

دوسری تصویر- "بحر عمان و جہازات" اس میں جہاز کو سمندر میں چلتے ہوئے دکھایا گیا ہے، پورے صفحہ کی ہے،

تیسری تصویر- "نمونہ مشعر الحرام و التقاط حصبات جمرات" اس میں احرام پوش حاجیوں کو کنکریاں چنتے اور عبادت کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے، پورے صفحہ کی ہے،

چوتھی تصویر- "نمونہ قریہ منی و مناسک آں از حلق و نحر و ذبح و رمی جمرات" اس میں حاجیوں

کو شیطان کو کنکریاں مارتے، حجامت بنواتے اور قربانی کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے، پورے صفحہ کی ہے،

پانچویں تصویر- "نمونہ عمارت مولد النبی صلی اللہ علیہ وسلم" اس میں حسب ذیل آثار کی تصویریں ہیں قبہ مولد شریف، مصلی، مولد شریف فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا، مدرسہ سلطانیہ، نمونہ مولد صدیق اکبرؓ، تکیہ بکتاشی، ان آثار میں حاجی فاتحہ اور دعا میں مصروف ہیں۔

چھٹی تصویر- "بیان کو نہاے مسجد الحرام نسبت بہ سموت اربع"۔ یہ چاروں سمتوں کے لحاظ سے خانہ کعبہ کی ایک چھوٹی سی تصویر ہے،

ساتویں تصویر- "نمونہ حاجیان ولایت مغرب"۔ اس میں شمالی افریقہ کے اسلامی ملکوں کے حجاج کے قافلہ اور ان کی فرودگاہ کا منظر دکھایا گیا ہے، پورے صفحہ کی ہے،

آٹھویں تصویر- "نمونہ قافلہ حاجیان مصر"۔ یہ مصر کے قافلہ کے حاجیوں کی نصف صفحہ کی تصویر ہے،

نویں تصویر- "نمونہ قافلہ حاج شام"۔ یہ شام کے حاجیوں کے قافلہ کی تقریباً پورے صفحہ کی تصویر ہے،

دسویں تصویر- "نمونہ قافلہ عرباں صحرانشین و اہل نجد"۔ یہ بدوی عربوں اور اہل نجد کے قافلہ کی تصویر ہے،

گیارہویں تصویر- "نمونہ قافلہ ہند"۔ چوتھائی صفحہ کی ہندوستانی قافلہ کی تصویر ہے،

بارہویں تصویر- "نمونہ قافلہ ایران"۔ نصف صفحہ کی ہے،

تیرہویں تصویر- "نمونہ سواری شریف برکات حاکم حرمین شریفین بجہت استقبال و پوشیدن تشریف سلطان محمد خوندکار روم"۔ یہ پورے صفحہ کی نہایت عمدہ تصویر ہے، اس میں خلیفۃ المسلمین سلطان محمد کے فرستادہ خلعت کے استقبال کے لیے شریف برکات کی سواری کا جلوس دکھایا گیا ہے۔

چودہویں تصویر- "سواری عبدی پاشا امیر حاج مصر بوقت رفتن از مکہ معظمہ بسوے مدینہ منورہ" اس میں محمل مصری کا جلوس دکھایا گیا ہے، پورے صفحہ کی تصویر ہے،

پندرہویں تصویر۔ "نمونہ بندر مخا" اس میں مخا کی بندرگاہ، یہاں کے حاکم سید حسن ان کی اقامت گاہ اور سواری کی نصف صفحہ کی تصویر ہے۔

سولہویں تصویر۔ "نمونہ شیر ربودن جوان"۔ اس میں ایک شیر کے ایک نوجوان کو پکڑ لینے کی چھوٹی سی تصویر ہے۔

سترہویں تصویر "نمونہ سوار غیبی کہ جوان را رہانید"۔ اس میں ایک غیبی سوار کے نوجوان کو شیر کے منہ سے چھڑانے کی تصویر ہے۔

اٹھارہویں تصویر۔ "نمونہ مواصلت جوان و مادر"۔ اس میں جوان کے اپنی ماں سے ملنے اور اس کی مسرت میں دعوت کی تصویر ہے۔

انیسویں تصویر۔ "نمونہ بندر جدہ"۔ اس میں جدہ کی بندرگاہ، اس کے مکانات، جامع مسجد اور حاکم جدہ کی تصویر ہے۔

اسلام اور عربی تمدن

شام کے مشہور فاضل اجل علامہ محمد کرد علی کی کتاب الاسلام والحضارۃ العربیۃ کا اردو ترجمہ جس میں مذہب اسلام اور اسلامی تمدن و تہذیب پر علمائے مغرب کے اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے، اور پھر یورپ پر اسلام اور مسلمانوں کے اخلاقی، علمی اور تمدنی احسانات اور اس کے اثرات و نتائج کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔

(از شاہ معین الدین احمد ندوی)

ضخامت ۲۳۴ صفحے قیمت :۔ عہ

"منیجر"

اسلامی رصد خانے

(از جناب شبیر احمد خاں صاحب غوری ایم اے، ایل ایل بی، رجسٹرار امتحانات عربی و فارسی اترپردیش)

آج سے چونسٹھ سال پیشتر اس موضوع پر مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم و مغفور نے ایک مبسوط مقالہ لکھا تھا، جو "الندوہ" (مارچ و مئی ۱۹۰۹ء) میں شائع ہوا، اس کے افتتاحیہ میں سید صاحب نے فرمایا تھا:۔

"اسلامی رصد خانوں کی تاریخ ایسی سخت تاریکی میں ہے کہ غیروں (دائرۃ المعارف) کو چھوڑ کر خود اپنوں (ابن خلدون) کو ان کی واقفیت نہیں ہے، اس لیے ان پر روشنی ڈالنے کی ضرورت ہے۔"

چوبیس سال بعد "خیام" میں اس کا حوالہ دیتے ہوئے انھوں نے پھر لکھا:۔

"میں نے الندوہ کے ماہ مارچ اور ماہ مئی ۱۹۰۹ء میں اسلامی رصد خانوں پر ایک مفصل مضمون لکھا ہے جس سے زیادہ مکمل مضمون اس باب میں اب تک میری نظر سے نہیں گزرا۔"

اور یہ واقعہ ہے کہ یہ صرف ۱۹۳۳ء تک بلکہ غالباً آج کے دن (۱۹۷۳ء) تک اس موضوع پر کسی محقق نے زحمت تحقیق گوارا نہیں کی، اور ہنوز سید صاحب کا یہ مفید مقالہ اپنے موضوع پر یہ واحد پیشکش ہے، لیکن گذشتہ پچاس سال میں مسلم ریاضی و ہیئت کے بہت سے شاہکار جو اس وقت خطوطات کی شکل

یں بھی کمیاب تھے، شائع ہوکر آج اس موضوع کے طالب علموں کی دسترس تک آگئے ہیں، لہٰذا ان نئے
ماخذ و مصادر کی روشنی میں اس "نقش اول" کی تجدید کی جا رہی ہے۔ ع

گاہ گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را

خلاصۂ مقال | سید صاحب نے اسلامی رصد خانوں کی تفصیل سے پیشتر غیر اسلامی رصد خانوں کی مختصر تاریخ دی تھی، پھر رصد گاہ مامونی کو شرفِ اولیت دینے کے بعد آلات رصدیہ کا اجمالی بیان کیا تھا، آخر میں اسلامی رصد خانوں کا تذکرہ کیا تھا۔

جہاں تک غیر اسلامی رصد خانوں کی تاریخ کا تعلق ہے، اور لوگوں نے بھی اس پر لکھا ہے، اس لیے اس کا اعادہ چنداں ضروری نہیں ہے، آلات رصدیہ کا تعارف ایک مستقل بحث ہے اور مستقل مقالہ کی متقاضی ہے، مقالہ کا مقصد اسلامی رصد خانوں کا تذکرہ ہے، سید صاحب نے اس ضمن میں حسب ذیل رصد خانوں کا ذکر کیا ہے:-

(۱) رصد مامونی بغداد، (۲) رصد مامونی دمشق (۳) رصد دینوری (۴) رصد بتانی
(۵) رصد بوزجانی (۶) رصد ابن اعلم (۷) رصد شرف الدولہ، (۸) رصد حاکمی
(۹) رصد ملک شاہی (۱۰) رصد بیرونی، (۱۱) رصد علاء الدین (۱۲) رصد کوشیار،
(۱۳) رصد ابن زرقال، (۱۴) رصد مامونی (۱۵) رصد مسترشد باللہ (۱۶) رصد فہاد شروانی
۱۷۔ رصد مراغہ، (۱۸) رصد ابن الحماد (ابن الکماد) ۱۹۔ رصد ابن شاطر (۲۰) رصد تقی الدین بن معروف شامی
۲۱۔ رصد شمس الدین محمد بن علی خواجہ ۲۲۔ رصد الغ بیگ، ۲۳۔ رصد فیروز شاہی، ۲۴۔ تیموری سلاطین اور علم ہیئت (ہمایوں، شاہجہاں)
(۲۵) رصد محمد شاہی

سید صاحب نے اسلامی رصد خانوں کا آغاز رصد مامونی بغداد سے بتایا ہے، چنانچہ فرماتے ہیں:-

"مسلمانوں میں رصد خانوں کی بنیاد تیسری صدی ہجری سے شروع ہوتی ہے، جب مامون سریر آرائے خلافت تھا۔

آگے چل کر فرماتے ہیں:-

"سب سے پہلا اسلامی رصد خانہ جیسا کہ عام طور سے معلوم ہے رصد مامونی ہے"۔

۱۹۴۶ء میں سید صاحب کے اس مفید مقالہ کا انگریزی ترجمہ اسلامک کلچر میں شائع ہوا، اس کا آغاز بھی اسی سے ہوتا ہے:-

The begining of Muslim observatories is traced back to Al-Mamun's days in the third century A.D

لیکن بعد میں مترجم نے انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے بیان پر اعتماد کرکے ترصید (فلکی مشاہدات) کا شرف اولیت احمد النہاوندی کے جندی سابور میں کیے ہوئے مشاہدات کو دیدیا، اس میں نہاوندی کی زیج کا نام المشتمل بتایا گیا ہے، لیکن چونکہ حاجی خلیفہ نے اس کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے، اس لیے مترجم کو اس کی صحت میں تردد ہے، (مزید تفصیل آگے آرہی ہے)

اگر اس مفید مقالے میں دو چیزیں اور بھی ہوتیں تو بڑا اچھا ہوتا: ماخذ و مصادر کا حوالہ اور تاریخی تسلسل (مثلاً رصد بوزجانی کو رصد ابن اعلم پر اور رصد ملک شاہی کو جو عہد سلاجقہ کا کارنامہ ہے، رصد بیرونی اور رصد علاء الدولہ سے پہلے بیان کیا ہے، جو تقریباً نصف صدی پیشتر ظہور میں آچکی تھیں)

انسانی معاشرہ کی دیگر مساعی کی طرح علمی تحریکات بھی سلسلۂ علل و معلولات کی پابند ہیں، اور ان کا آغاز و ارتقاء، اور اسراع و ابطاء، تاریخی عوامل کا نتیجہ ہوتا ہے، اس کے پیش نظر یہ مختصر جائزہ پیش کیا جارہا ہے، اس کے ساتھ اس اصول کے تحت کہ انسانی مساعی کی تاریخ فجائی نہیں بلکہ تدریجی و تسلسلی ہوا کرتی ہے، رصدگاہ مامونی کا پس منظر بھی ایک طائرانہ نگاہ کا مستحق ہے، اس لیے اس کا آغاز اسی سے کیا جارہا ہے، و باللہ التوفیق]

(۱) رصدگاہ مامونی سے پہلے

سرکاری سرپرستی میں پہلی رصدگاہ بعہد مامون الرشید تعمیر ہوئی، مگر علم الہیئت کے ساتھ اعتناء اور باقاعدہ ارصاد اور فلکیاتی مشاہدات کا آغاز اس سے پہلے ہو چکا تھا، خود اسلام ہیئتی سرگرمیوں کی ہمت افزائی کرتا ہے، اس لیے مسلم علم الہیئت کا نقطۂ آغاز بجا طور پر عہد نبوت کو قرار دیا جا سکتا ہے۔

۱۔ عہد نبوی اور خلافت راشدہ

ہیئتی سرگرمیاں اور فلکیاتی مشاہدات ملت اسلامیہ کا مقدس ترین ورثہ ہے۔ اسی نے ہمارے جد امجد سیدنا ابراہیم علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی چشم جہاں بیں پر توحید کا سرمہ لگایا، بقول اقبال

وہ سکوت شام صحرا میں غروب آفتاب جس سے روشن تر ہوئی چشم جہاں بین خلیل

اسلام مظاہر کائنات کے مشاہدات کی (جو تمام طبیعی علوم کی اصل ہے) عموماً تحریص و ترغیب کرتا ہے، قرآن کہتا ہے:

أَوَلَمْ يَنظُرُوا فِي مَلَكُوتِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ مِن شَيْءٍ

اور خاص طور سے فلکی مشاہدات کی، کیونکہ یہ مطالعہ انسان ہی کے فائدے کے لیے ہے

هُوَ الَّذِي جَعَلَ الشَّمْسَ ضِيَاءً
وَالْقَمَرَ نُورًا وَقَدَّرَهُ مَنَازِلَ
لِتَعْلَمُوا عَدَدَ السِّنِينَ وَالْحِسَابَ
مَا خَلَقَ اللّٰهُ ذٰلِكَ إِلَّا بِالْحَقِّ

وہی ہے جس نے سورج کو جگمگاتا بنایا اور
چاند چمکتا اور اس کے لیے منزلیں ٹھہرائیں کہ
تم برسوں کی گنتی اور (مہینوں، دنوں ساعتوں) کا
حساب جانو، اللہ نے اسے نہیں بنایا مگر حق (کہ اس سے
اس کی قدرت اور اس کی وحدانیت کے
دلائل ظاہر ہوں)

چنانچہ جب آیۂ کریمہ "إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ" الآیہ کا نزول ہوا تو جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

"ویل لمن لاکھا بین لحییہ ولم یتفکر فیہا"
تباہی ہے اس کے لیے جو اپنے جبڑوں سے اس آیۂ کریمہ کی تلاوت کرتا ہے مگر اس کے معانی پر غور نہیں کرتا۔

اور یہ رجحان دیندار طبقے میں آخر تک برقرار رہا، چنانچہ امام غزالی فرماتے ہیں:-

من لم یعرف الہیئۃ والتشریح فہو عنین فی معرفۃ اللہ تعالیٰ
جو شخص ہیئت اور علم التشریح نہیں جانتا وہ معرفت باری تعالیٰ میں ناقص ہے۔

اسی کے ساتھ اسلام نے نجوم اور جوتش کے ڈھکوسلوں کی بڑی سختی سے بیخ کنی کی، چنانچہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

من اتی منجما فلیس منا[1]
جو نجومی کی بات کا اعتبار کرتا ہے وہ دائرہ اسلام سے خارج ہے۔

بعد میں نجوم کی ممانعت میں خلفائے راشدین نے بھی اسی تشدد پر عمل کیا، حضرت علیؓ نے ایک موقع پر فرمایا تھا:-

ایہا الناس ایاکم وتعلم النجوم الا
ما یہتدی بہ فی بر او بحر فانہا
تدعو الی الکہانۃ۔ المنجم
کالکاہن والکاہن کالساحر
والساحر کالکافر والکافر
فی النار

اے لوگو خبردار جوتش نہ سیکھنا سوائے اتنے علم نجوم کے
جس سے خشکی اور سمندر میں راستہ تلاش ہو سکے، کیونکہ
جوتش کہانت کا متقاضی ہے، منجم کاہن کے مانند ہے اور
کاہن جادوگر کی طرح اور جادوگر کافر کی طرح،
اور کافر دوزخ میں جائیگا۔

---

[1] ابن قتیبہ نے کتاب الانواء (ص ۱۴۲) پر حدیث نبوی بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "ثلث من امور الجاہلیۃ الطعن فی الانساب والنیاحۃ والانواء"

اس تہدید نے جوتش کو ہمیشہ کے لیے ممنوع کر دیا، اس طرح اسلام نے علم الہیئت کو پہلی مرتبہ نجوم کے ڈھکوسلوں سے آزاد کر کے خالص سائنٹفک بنیادوں پر قائم کر دیا،

۲۔ اموی دور | اموی ملوکیت جس نے زمانہ جاہلیۃ کی بعض باتوں کا احیا کیا، اس کے توہمات اور ڈھکوسلوں کو بھی سر اٹھانے کی اجازت دیدی، چنانچہ عبد الملک بن مروان کے زمانہ سے تنجیم کا ذکر سننے میں آتا ہے، وہ قدیم نجوم میں سے "علم مہاب الریاح" (ہواؤں کا رخ پہچاننے کا علم) سے واقف تھا۔[۱] حجاج بن یوسف والی عراق کے پاس ایک خارجی "سبرہ بن الجعد" لایا گیا جس سے حجاج نے دوسری باتوں کے علاوہ دریافت کیا:۔

هل تعرف النجوم قال انی لاعرف منازل القمر وما اهتدی به فی السفر[۲]

حجاج نے پوچھا کیا تم نجوم جانتے ہو؟ اس نے جواب دیا میں چاند کی منزلیں پہچانتا ہوں نیز ستاروں سے سفر میں رہنمائی کرنا جانتا ہوں،

عبد الملک اپنے تفقہ کے باوجود نجومیوں پر اعتماد کرتا تھا، چنانچہ اس نے اپنے منجم کے مشورہ سے متاثر ہو کر اپنے بھائی کو جسے دشمن سے لڑنے کیلئے بھیجا تھا اس دن لڑائی موقوف کرنے کے لیے کہلا بھیجا،

قد کان مع عبد الملک منجم مقدم وقد اشار علی عبد الملک ان لا تحارب له خیل فی ذلک الیوم فانه منحوس ولیکن حربه بعد ثلاث فانه ینصر[۳]

عبد الملک کے ساتھ ایک نجومی تھا جو اس کا بڑا مقرب تھا، اس نے عبد الملک کو مشورہ دیا تھا کہ اس دن سوار جنگ نہ کریں کیونکہ وہ منحوس دن ہے، اور جنگ تین دن بعد ہو، کیونکہ اس میں اس کی فتح ہوگی۔

مگر بھائی نہیں مانا اور کہلا بھیجا کہ

لا التفت الی زخاریف منجمک[۴]

میں آپکے منجم کی خرافات کی طرف توجہ نہیں کرتا،

۱؎ مروج الذہب برحاشیہ کامل ابن اثیر جلد سابع ص ۴ ۲؎ ایضاً ص ۶۲ ۳؎ ایضاً ۴؎ ایضاً ص ۲۵

بایں ہمہ علم نجوم حکماء و اطباء کے ذریعے امراء کے دربار میں مقبول ہوتا رہا، ان میں سب سے زیادہ خالد بن یزید بن معاویہ اس سے متاثر ہوا، چنانچہ جب وہ حصول خلافت سے مایوس ہو گیا تو کیمیا اور مہوسی کی ہوس میں پڑ گیا۔[۱] اس غرض سے اس نے کیمیا کے علاوہ طب اور نجوم کی کتابیں بھی عربی میں ترجمہ کرائیں، ابن ندیم لکھتا ہے:۔

الذی عنی باخراج کتب القدماء فی الصنعة خالد بن یزید بن معاویة ... وهو اول من ترجم له کتب الطب والنجوم وکتب الکیمیاء[۲]

پہلا شخص جس نے علم کیمیا کی کتابیں عربی میں ترجمہ کرائیں خالد بن یزید بن معاویہ ہے ... وہ پہلا شخص ہے جس کے لیے طب، نجوم اور کیمیاء کی کتابیں ترجمہ کی گئیں۔

جوتش کے علاوہ خالد کو سائنٹفک علم الہیئت سے بھی دلچسپی تھی، چنانچہ بطلیموس کا کرہ بھی اس نے کسی طرح حاصل کیا تھا، بعد میں یہ کرہ فاطمیہ مصر کے پاس پہنچا، جہاں ۴۳۵ھ میں اسے ابن السنبذی نے دیکھا تھا، ابن القفطی اس سے نقل کرتا ہے:۔

فرأیت من کتب النجوم والهندسة والفلسفة خاصة ستة آلاف وخمس مائة جزء وکرة نحاس من عمل بطلیموس وعلیها مکتوب حملت هذه الکرة من الامیر خالد بن یزید بن معاویة[۳]

میں نے وہاں نجوم، ہندسہ اور فلسفہ کی خاص طور سے ساڑھے چھ ہزار کتابیں دیکھیں، ان کے ساتھ ایک تانبے کا کرہ بھی دیکھا جو بطلیموس کے ہاتھ کا بنا ہوا تھا، اور جس پر لکھا تھا کہ یہ کرہ امیر خالد بن یزید بن معاویہ کے یہاں سے لایا گیا ہے۔

اور امویوں کے عہد زوال میں تو عیش پرستی کے ساتھ یہ توہم پرستی بہت زیادہ بڑھ گئی تھی

۱؎ الفہرست لابن ندیم ص ۴۹۰ ۲؎ ایضاً ص ۴۹۷ ۳؎ اخبار العلماء باخبار الحکماء ص ۲۸۶

چنانچہ سیوطی نے حماد الراویہ سے روایت کی ہے کہ ولید بن یزید (۱۲۵ھ تا ۱۲۶ھ) نے دو نجومیوں سے اپنی جنم کنڈلی بنوائی تھی،

وقال حماد الراوية كنت يوماً عند	حماد الراویہ نے کہا ہے کہ میں ایک دن ولید
الوليد فدخل عليه منجمان	کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ دو نجومی اس کی خدمت
فقالا نظرنا فيما امرتنا فوجدناك	میں آئے اور کہا جس جنم تیرے کا آپ نے حکم دیا تھا
تملك سبع سنين[1]	ہم نے بنا کر دیکھا تو معلوم ہوا آپ سات سال حکومت کرینگے۔

اس لیے اس فن میں کتابوں کا لکھا جانا فطری تھا، چنانچہ نجوم کی ایک کتاب کا مخطوطہ جس کا سال کتابت ۱۲۵ھ ہے، حسب تصریح نلینو میلان کے کتب خانہ (Biblioteca Ambrosiana, Milano) میں موجود ہے، اس سے اموی خلافت کے عہد زوال میں نجوم کے فروغ اور اس کی مقبولیت کا اندازہ ہو سکتا ہے،

۳۔ عباسی خلافت کا آغاز ۱۳۲ھ میں امویوں کے بجائے عباسی خلافت کا آغاز ہوا، اسی زمانے سے حکومت کی سرپرستی میں علم و حکمت کے ساتھ اعتناء و اہتمام شروع ہوا، پہلے عباسی خلیفہ سفاح کا زمانہ اپنے اموی حریفوں کے قتل اور خونریزی میں گزرا،

سفاح کے بعد اس کا بھائی ابوجعفر منصور (۱۳۶ھ۔ ۱۵۸ھ) خلیفہ ہوا، اس کی حکومت کے پہلے نو سال ابو مسلم خراسانی کے قتل اور تخت خلافت کے علوی دعویداروں کے استیصال میں گذرے، اس سے فارغ ہو کر اس نے بغداد کی بنیاد ڈالی، جو عرصہ تک دنیائے علم و ادب کا مرکز رہا،

منصور کو خود علم و ادب کی سرپرستی سے دلچسپی تھی، قاضی صاعد نے لکھا ہے:۔

لہ تاریخ الخلفاء للسیوطی ص ۱۰۱، ۲ طبقات الامم قاضی صاعد اندلسی ص ۷۰،

"پس جب اللہ تعالیٰ نے اموی خلافت کی جگہ ہاشمی (عباسی) خلافت قائم کی اور انھیں حکمرانی کا موقع دیا تو ہمتوں میں استواری بخشی اور فطانتیں بیدار ہو گئیں، اس خاندان میں پہلا شخص جس نے علوم و فنون کی طرف توجہ کی خلیفہ ثانی ابوجعفر منصور تھا، جو فقہ میں دستگاہ عالی اور علم فلسفہ بالخصوص فن نجوم میں کمال رکھنے کے ساتھ ساتھ ان علوم کا شوقین اور اسکے ماہرین کا قدردان تھا۔"[1]

منصور نے علوم عقلیہ کی کتابیں باہر سے ترجمہ کروا کر منگائیں، ابن خلدون لکھتا ہے:۔

"پس خلیفہ ابوجعفر نے بادشاہ روم کو ریاضیات کی کتابوں کا عربی میں ترجمہ کرا کے بھیجنے کے لیے لکھا۔ اس نے اقلیدس کی اصول ہندسہ اور طبیعیات کی کچھ کتابیں اسے بھیجیں جنھیں مسلمانوں نے پڑھا اور ان کے مضامین سے واقف ہوئے، اس سے ان کتابوں کے لیے جو روم میں باقی رہ گئی تھیں، انکا شوق اور بڑھ گیا۔"[2]

علوم عقلیہ میں سے نجوم کے ساتھ منصور کو خصوصیت سے دلچسپی تھی، وہ بالطبع نجوم کا دلدادہ تھا، قاضی صاعد اندلسی کی تصریح اوپر مذکور ہوئی، سیوطی نے بھی محمد بن علی خراسانی سے نقل کیا ہے:

المنصور اول خليفة قرب	منصور پہلا خلیفہ ہے جس نے نجومیوں کو تقرب
المنجمين وعمل باحكام النجوم[3]	بخشا اور احکام نجوم پر عمل کیا،

چنانچہ جب اس نے ابراہیم بن عبد اللہ کے مقابلے پر عیسیٰ بن موسیٰ کو بھیجا تو حسب تصریح ابن الاثیر اس کی ہمت افزائی کے لیے کہا کہ یہ خبیث یعنی منجمین کہتے ہیں کہ انجام کار فتح تمھاری ہی ہوگی،[4] اسی طرح جب نوبخت منجم اسے فتح کی خوشخبری سنانے آیا تو اس نے اس کو انعام میں ایک بڑی جاگیر دی،[5]

منصور کا منجم خاص نوبخت تھا، جب وہ بوڑھا ہو گیا تو اس کا بیٹا ابوسہل بن نوبخت منجم باشی ہوا، اس زمانہ کا دوسرا مشہور منجم ماشاء اللہ یہودی تھا، جس نے نوبخت کے ساتھ مل کر

لہ طبقات الامم قاضی صاعد اندلسی ص ۷۵، ۲ مقدمہ ابن خلدون ص ۴۸۱ ۳ تاریخ الخلفاء للسیوطی ص ۱۸۳

۴ کامل ابن الاثیر جلد خامس ص ۲۱۰ ۵ ایضاً ص ۲۱۲

بغداد کی بنیاد ڈالنے کی صورت نکالی تھی،[۱] نوبخت اور ابراہیم الفزاری ہی کی نگرانی میں مہندسین (انجینیروں) نے بغداد کو تعمیر کیا تھا، شہر کے چار ربعے چار مشہور مہندسین عمران بن الوضاح، عبداللہ ابن محرز، حجاج بن یوسف اور شہاب بن کثیر نے تعمیر کیے،[۲] مشہور ہیئت دانوں کے نام آگے آرہے ہیں:۔

غالباً اس وقت بغداد میں عرب نظام فلکیات متداول تھا، جسے "علم الانواء" بھی کہتے تھے، کیونکہ اسی انداز پر ابراہیم بن حبیب الفزاری نے اپنی زیج "کتاب الزیج علی سنی العرب" مرتب کی تھی،[۳] اور اسی انداز پر اس کے بیٹے محمد بن ابراہیم الفزاری سے منصور نے برہم سدھانت کا ترجمہ کرایا،[۴] دوسرا ہیئتی نظام ایرانیوں کا تھا جس کی بنیاد "زیج شہریار" (زیک شتریار) پر تھی، اسی پر نوبخت اور اس کی اولاد کا عمل تھا،

اسی زمانہ میں ایک تیسرا نظام ہیئت بغداد کے علمی حلقوں میں داخل ہوا، یہ ہندوستان کا ہیئتی نظام (السند ہند) تھا، چنانچہ قاضی صاعد اندلسی نے لکھا ہے:۔

"اور حسین بن محمد بن حمید المعروف بابن الآدمی نے اپنی بڑی زیج معروف بہ "نظم العقد" میں لکھا ہے کہ ۱۵۶ھ میں خلیفہ ابو منصور کے دربار میں ایک شخص ہندوستان سے پہنچا، جو وہاں کے مخصوص ہیئتی حساب سدھانت میں ماہر تھا،...... اس کے ہمراہ ایک کتاب (برہم سدھانت) بھی تھی جس میں بارہ ابواب تھے...... منصور نے اس کتاب کے عربی میں ترجمہ کرنے، نیز اس کے اصول پر علم ہیئت کی ایک کتاب لکھنے کا حکم دیا جسے عرب حرکات کواکب کے حساب میں اصل و معتمد علیہ بنائیں، پس محمد بن ابراہیم الفزاری نے اس کام کو انجام دیا، اور اس کی مدد سے ایک کتاب تیار کی، جسے ماہرین فلکیات السند ہند الکبیر کہتے ہیں۔ اس زمانہ کے لوگ خلیفہ مامون الرشید کے عہد تک اسی پر عمل کرتے رہے، تا آنکہ ابو جعفر محمد بن موسیٰ الخوارزمی نے مامون کے ایما سے اسے مختصر کیا۔"[۵]

۱۔ ۲ کتاب البلدان لابن الواضح الیعقوبی ص ۲۳۸، ۲۴۱ ۳ اخبار العلماء باخبار الحکما، ص ۲۰۴ ۴ ایضاً ص ۱۷۷
۵ طبقات الامم ص ۸،

برہم سدھانت ہی کے ذریعے مسلمان مہندسین "جیب" کے تصور سے واقف ہوئے، ورنہ یونانی اور ایرانی علم الہیئت میں "اوتار" (Chords) ہی کے ذریعے "مثلثاتی حسابات" کیے جاتے تھے، علم المثلثات کی ترقی میں یہ مسلمانوں کا پہلا قدم تھا، اس زمانہ کے مشہور ہیئت داں حسب ذیل تھے:۔

ابراہیم بن حبیب الفزاری:۔ سمرہ بن جندب فزاری کی اولاد میں سے تھا، نجوم و ہیئت میں دستگاہ عالی رکھتا تھا، اور اس فن کی کئی کتابوں کا مصنف ہے، مثلاً قصیدہ فی علم النجوم، کتاب مقیاس الزوال، کتاب الزیج علی سنی العرب، کتاب العمل بالاصطرلابات، ذوات الحلق، کتاب العمل بالاصطرلاب المسطح،[۱]

محمد بن ابراہیم الفزاری:۔ علم ہیئت اور حرکات کواکب کا فاضل اور نجومی پیشین گوئی کا ماہر تھا، حسب تصریح ابن القفطی وہ پہلا شخص ہے جس نے تاریخ اسلام میں عموماً اور عباسی دور میں خصوصاً اس علم [illegible] حاصل کیا، اسی نے برہم سدھانت کا ترجمہ کیا جو السند ہند کے نام سے عرصہ تک مسلمانوں میں متداول رہا،[۲] اور اس کے انداز پر اپنی زیج تیار کی، جو البیرونی کے زمانہ تک موجود تھی،

یعقوب بن طارق:۔ سدھانت کو عربی میں منتقل کرنے میں محمد بن ابراہیم الفزاری کا شریک تھا، ہندی عالم سدھانت کی مدد سے اس نے ہندوستانی ہیئت کے "ادوار اربعہ" (چترنگ) کو عربی میں منتقل کیا تھا،[۳] علم ہیئت میں اس کی خاص تصنیف "کتاب ترکیب الافلاک" ہے، اس کے علاوہ اس کی تصانیف میں کتاب تقطیع کردجات الجیب، کتاب ما ارتفع من قوس نصف النہار، کتاب الزیج محلول فی السند ہند، مشہور ہیں،[۴]

الطبری:۔ حسب تصریح ابن واضح الیعقوبی ان لوگوں میں تھا جن کی نگرانی میں انجینیروں نے بغداد کو تعمیر کیا تھا،[۵] غالباً اس کا پورا نام عمر بن فرخان الطبری ہے جو تاریخ اسلام کے چار حاذق مترجمین

---

۱ اخبار العلماء باخبار الحکما، ص ۲۸۳ ۲ طبقات الامم ص ۹، ۳ کتاب الہند للبیرونی ص ۲۰۸ ۴ الفہرست ص ۳۸۰ ۵ کتاب البلدان یعقوبی ص ۲۴۱

میں محسوب ہوتا ہے۔[1] اس نے بطلیموس کی "کتاب الاربعہ" کی شرح لکھی تھی، (جسے ابو یحییٰ البطریق نے ترجمہ کیا تھا)[2]

نوبخت:۔ منصور کا منجم خصوصی تھا، اسی نے ماشاء اللہ کے ساتھ مل کر بغداد کا سنگِ بنیاد رکھنے کی صورت نکالی تھی۔[3]

ماشاء اللہ:۔ منصور کے زمانہ کا بہت بڑا جوتشی تھا، نجوم اور جوتش کی متعدد کتابوں کے علاوہ ابن الندیم نے اصطرلاب پر اس کی تصانیف میں "کتاب صنعۃ الاصطرلابات والعمل بہا" اور "کتاب ذات الحلق" کے نام لکھے ہیں۔[4]

ان منجمین اور ہیئت دانوں میں حسب تصریح ابن القفطی ابراہیم بن حبیب الفزاری کو شرف اولیت حاصل ہے، وہی عہد اسلام میں پہلا فاضل ہے جس نے اصطرلاب بنایا، اس کی کتاب تسطیح الکرہ بعد کے تمام مسلمان ہیئت دانوں کا اصطرلاب میں ماخذ تھی،

"وھو اول من عمل فی الاسلام اصطرلابا ولہ کتاب فی تسطیح الکرہ منہ اخذ کل الاسلامیین۔"[5]

منصور نے ۱۵۸ھ میں وفات پائی اور مہدی اس کا جانشین ہوا، اس کا سارا وقت زنادقہ کے استیصال میں گذرا، باایں ہمہ اس نے علمی سرپرستی کو بھی جاری رکھا، چنانچہ زنادقہ کی اصلاح کے لیے متکلمین سے الحاد و زندقہ کے رد میں کتابیں لکھوائیں، اس کے ایما سے اس کے نصرانی کاتب ابو نوح نے جاثلیق طیماتاؤس کی مدد سے ارسطو کی "کتاب الجدل" (طوبیقا) کا سریانی سے عربی میں ترجمہ کیا، اس کے علاوہ ارسطا طالیسی منطق کی پہلی تین کتابوں (قاطیغوریاس، باری ارمینیاس اور انالوطیقا) نیز فرفوریوس کی ایساغوجی کا عربی میں دوسرا ترجمہ کیا، پہلا ترجمہ عبد اللہ بن المقفع

[1] الطبقات الاطباء لابن ابی اصیبعہ ج ۱ ص ۲۰۰ [2] اخبار العلماء باخبار الحکماء ص ۱۶۲ [3] کتاب البلدان یعقوبی ص ۲۳۸
[4] الفہرست ص ۳۸۲ [5] اخبار العلماء باخبار الحکماء ص ۴۴

نے کیا تھا،

اس علمی سرپرستی کے ساتھ ساتھ اس نے نجوم کی سرپرستی بھی جاری رکھی، اس کے دربار میں متعدد نجومی تھے، جن کا صدر رودمیں توفیل (Theophilus) بن توما الرہاوی تھا، جو نجوم اور جوتش کا بڑا زبردست ماہر تھا، ابن القفطی لکھتا ہے:۔

"توفیل بن توما النصرانی المنجم الرھاوی وکان ھذا المنجم بغدادی وھو رئیس منجمی المھدی وکان خبیراً بجوادث النجوم ولہ فی احکام النجوم اصابات عجیبۃ۔"[1]

مہدی نے ۱۶۹ھ میں وفات پائی، اس کے بعد ہادی تخت نشین ہوا، مگر سال بھر بعد مر گیا، ہادی کے بعد ہارون الرشید خلیفہ ہوا،

ہارون کا عہد حکومت برامکہ کے عروج و زوال کی داستان ہے، برامکہ کے مورثِ اعلیٰ بلخ کے مشہور بدھ مٹھ "نوبہار" کے متولی "پرموک" رہے تھے، اسی لیے یہ خاندان برمکی کہلاتا ہے، علم دوستی و علماء نوازی اس خاندان نے اپنے اسلاف سے ورثہ میں پائی تھی، ان کی سرپرستی نے بغداد کو دانش کدۂ مشرق بنا دیا تھا، انھیں نے ہندوستانی علوم بالخصوص ہندی طب کو بغداد میں متعارف کرایا، انھیں کے ایما سے سلما الحرانی نے ارسطا طالیسی منطق کی پہلی تین کتابوں اور ایساغوجی کا تیسری مرتبہ عربی میں ترجمہ کیا،

برامکہ کی علمی سرپرستی اسلام کی علمی و ثقافتی تاریخ کا ایک مستقل باب ہے، لیکن ریاضی و ہیئت کی تاریخ میں ان کے دو کارنامے مشہور ہیں،

اولاً: اصول اقلیدس کا ترجمہ۔ ابن خلدون کہتا ہے کہ اس کتاب کا پہلا ترجمہ منصور کے زمانہ میں ہوا تھا، لیکن بعد میں یہ غیر معروف ہو گیا، برامکہ کی سرپرستی میں اس کا از سر نو ترجمہ ہوا، نیا ترجم

[1] اخبار العلماء باخبار الحکماء ص ۷۷،

حجاج بن یوسف بن مطر تھا، ابن الندیم کہتا ہے:

"حجاج بن یوسف بن مطر نے اصول اقلیدس کے دو ترجمے کیے، ایک نقل ہارونی کے نام سے مشہور ہے اور وہ پہلا ترجمہ ہے، دوسرا نقل مامونی کے نام سے موسوم ہے[۱]"

موخر الذکر کے مقدمہ میں مترجم لکھتا ہے:-

"ہارون الرشید کے عہد خلافت میں یحییٰ بن خالد بن برمک کے ایما سے حجاج اس کتاب کا عربی میں ترجمہ کرنے پر مامور ہوا"

ثانیاً:- المجسطی کا ترجمہ جو یونانی ہیئت کا آخری شاہکار ہے، یحییٰ بن خالد برمکی نے سلما اور ابو حسان سے اس کا عربی میں ترجمہ کرایا۔

اول من عنی بتفسیرہ واخراجہ الی	سب سے پہلے جس نے المجسطی کو عربی میں ترجمہ کرانے
العربیة یحیی بن خالد بن برمك	اور اس کی شرح و تفسیر کرانے پر توجہ کی، وہ
ففسرہ جماعة فلم یتقنوہ ولم	یحییٰ بن خالد برمکی تھا، بہت سے لوگوں نے اسکی
یرض ذلك. فندب لتفسیرہ	تفسیر کرکے اسے پیش کی مگر وہ ان کی شرح
اباحسان وسلم صاحب بیت	سے مطمئن نہ ہوا، آخرکار اس نے ابا حسان
الحکمة فاتقناہ واجتہدا فی	اور سلما صاحب بیت الحکمة کے سپرد یہ کام کیا
تصحیحہ بعد ان احضر النقلة	جسے انھوں نے بڑی خوش اسلوبی سے انجام
المجودین فاختبر انقلہم واخذا	دیا، انھوں نے ماہر مترجمین کو بلا کر ترجمے کرائے
بانصحہ واصحہ وقد قیل	اور ان میں سے جو سب سے زیادہ صحیح اور فصیح تھا
ان الحجاج بن مطر نقلہ ایضاً[۲]	اسے یحییٰ کے حضور میں پیش کیا، یہ بھی کہا جاتا ہے کہ

حجاج بن یوسف نے بھی اس کا ترجمہ کیا تھا۔

[۱] الفہرست ص ۳۷۱ [۲] ایضاً ص ۳۷۴

برامکہ کشمیری نژاد تھے، بعض لوگوں کے خیال میں ایرانی تھے، بہر حال وہ عجمیوں کی طرح نجوم اور جوتش کے قائل تھے۔ ان کی سرکار میں نجومیوں کی ایک کثیر جماعت رہتی تھی، جن میں عمر بن فرخان الطبری خاص طور سے مشہور ہے۔ اسی نے یحییٰ بن خالد کا زائچہ بنایا تھا[۱]، اور بھی نجومی تھے، یحییٰ بن خالد خود بھی دیگر علوم کے علاوہ نجوم اور ہیئت کا ماہر تھا۔

علم ہیئت کی تاریخ میں برامکہ کا نام اس لیے بھی مشہور ہے کہ ان کے زمانہ میں عہد اسلام کی پہلی ترصید (فلکیاتی مشاہدہ) ظہور میں آئی جس کو تاریخ نے محفوظ رکھا ہے۔ یہ جندی سابور کی قدیم رصد گاہ کے فلکی مشاہدات تھے، جنھیں یحییٰ بن خالد کے عہد وزارت میں احمد بن محمد النہاوندی نے اپنی زیج مسمی بہ "المشتمل" میں قلمبند کیا تھا۔ ابن یونس کا تو یہ خیال ہے کہ دنیا میں بطلیموس کی ارصاد کے بعد عہد مامونی تک احمد بن محمد النہاوندی کے علاوہ کسی اور شخص نے فلکی مشاہدات ہی نہیں کیے، چنانچہ وہ اپنی زیج میں لکھتا ہے:-

ولا اعلم بین رصد بطلیموس	اور میں بطلیموس کے ہیئتی مشاہدات اور "اصحاب
وبین رصد اصحاب الممتحن رصدا	ممتحن" کے ہیئتی مشاہدات کے درمیانی عرصہ میں
الا رصد احمد بن محمد النہاوندی	سوائے احمد بن محمد النہاوندی الحاسب کی
الحاسب بمدینة جندی سابور	ترصید کے کسی اور ترصید سے واقف نہیں ہوں،
فی ایام یحیی بن خالد بن برمك فانہ	نہاوندی نے یہ ترصید شہر جندی سابور میں
رصد ارصادا اثبتہا فی زیج	یحییٰ بن خالد بن برمک کے زمانہ میں کی تھی،
سماہ المشتمل۔ (زیج ابن یونس ص ۱۵۱)	اس نے جن ہیئتی مشاہدات کی ترصید کی تھی انھیں

اپنی زیج میں درج کیا تھا جس کا نام "المشتمل" رکھا تھا۔

سید صاحب نے اس رصد گاہ کا ذکر نہیں کیا، بلکہ رصد گاہ مامونی ہی کو عہد اسلام کی پہلی رصد گاہ

[۱] اخبار العلما، باخبار الحکما ص ۱۶۱

قرار دیا ہے،

"سب سے پہلا اسلامی رصد خانہ جیسا کہ عام طور سے معلوم ہے، رصد مامونی ہے۔"

اس مضمون کے انگریزی مترجم نے بھی اسی قول پر اعتماد کرکے اپنے ترجمہ کا آغاز کیا ہے:

"The beginning of Muslim observatories is Traced back to 1- Mamun in The Third century A.D."

اور اگرچہ آگے چل کر احمد بن محمد النہاوندی کے مشاہدات فلکیہ کو شرف اولیت دیا ہے اور لکھا ہے:

The first series of regular observations with The aid of fairly accurate instruments appears to have been made at Jundi-Shappur (a town in Khuzistan, S.W. Iran) in The first years of The nineth century A.D. by Ahmad an Nehawandi, who prepared an almanac entitled Zij-al-Mushtamil."

مگر انھیں اس کی تصریح کسی اصل عربی ماخذ میں نہیں ملی بلکہ اس باب میں ان کا (مترجم کا) اعتماد انسائیکلوپیڈیا آف اسلام پر تھا، لیکن چونکہ حاجی خلیفہ نے کشف الظنون میں احمد النہاوندی کی "زیج مشتمل" کا ذکر نہیں کیا اس لیے انھیں اس کی صحت میں تردد ہے:-

The Translator has Taken The liberty to supplement This information from The Encyclopaedia of Islam (article Astronomy)

although Zij-al-Mushtamil is not reffered to in Kashf-uz-Zunun."

حالانکہ یہ تردد بے بنیاد ہے، کیونکہ کشف الظنون "کتابیات" (Bibliography) کی کتاب ہے اور علوم و فنون کی تاریخ کے باب میں اس پر غیر مشروط اعتماد نہیں کیا جاسکتا، بالخصوص جہاں وہ خاموش ہے، ان مقامات کے ذکر کو مشکوک نہیں کہا جاسکتا، بشرطیکہ وہ قابلِ اعتماد مآخذ و مصادر میں مذکور ہوں۔

بہرحال ابن یونس کی تحقیق کے مطابق جندی سابور کی یہ رصد گاہ اور احمد النہاوندی کے مشاہدات فلکیہ اسلام کی تاریخ میں پہلی ہیئتی و رصدی کاوش ہیں، اور اس کی زیج "مشتمل" ابن یونس کے زیر مطالعہ رہی تھی، "زیج مشتمل" کی رو سے "فارسی سال" کے اندر "وسط شمس" کی مقدار "یاکطمہ مم" تھی (یا=۱۱-۲۹-۴۵-۴۰-۴۰) تھی جو مبسوط ہو کر "شنظمہ مم" آتی ہے (=۳۵۹-۴۵-۴۰-۴۰)

ابن یونس کا یہ بھی خیال ہے کہ احمد النہاوندی نے اپنی اور ابرخس (Hipparcus) کے رصدوں کے تفاوت کو درمیانی عرصہ سے تقسیم کرکے نکالا تھا۔ "و اراہ استعمل القسمۃ فیما بین رصدہ و رصد ابرخس۔"

بہرحال عہد ہارونی میں نجوم و ہیئت کی ترقی بلکہ رصد گاہ اور ارصاد کی ابتدا برامکہ کے اعتنا و اہتمام کا نتیجہ تھی، لیکن ۱۸۷ھ میں یہ علم دوست خاندان ہارون کے شکوک و شبہات کا شکار ہو کر برباد ہو گیا، ان کے ساتھ علمی سرپرستی کا کارخانہ بھی جس نے ہارون کے بغداد کو دوکش یونان و اسکندریہ بنا دیا تھا، درہم برہم ہو گیا۔ اہل کمال جو برامکیوں کی نوازشوں سے فیضیاب ہو کر علم و حکمت کی ترقی میں ایک دوسرے سے گوئے سبقت لے جانے کی کوشش کرتے تھے،

بد دل ہو کر خانہ نشین ہو گئے،

۱۹۳ھ میں ہارون نے بھی وفات پائی اور اس کی وصیت کے مطابق امین جو اس کی ملکہ زبیدہ کے بطن سے تھا تخت نشین ہوا، مگر جلد ہی دراندازوں کے کہنے میں آکر دوسرے بھائی مامون سے لڑ بیٹھا، امین و مامون کی لڑائی محض برادرانہ خانہ جنگی نہ ثابت ہوئی بلکہ عرب کے "سوزوروں" اور "عجم کے حسن طبیعت" کا مقابلہ بن گئی، جس میں موخرالذکر کی فتح ہوئی۔

ہندوستان کے عہد وسطیٰ

کی

ایک ایک جھلک

یہ تیموری عہد سے پہلے کے مسلمان حکمرانوں کے دور کی سیاسی، تمدنی اور معاشرتی تاریخ ہے، جس میں مسلمانوں کی تاریخ کے روشن پہلو ہندو نامور مورخوں کی زبان سے اور ہندوؤں کے علمی کارنامے مسلمان مورخوں کے قلم سے نقل کیے گئے ہیں، یہ دارالمصنفین کے سلسلۂ تصنیفات کی دوسری کتاب ہے، جس پر یو، پی گورنمنٹ کی طرف سے مصنف کو ایک ہزار کا گراں قدر انعام ملا ہے،

مرتبہ سید صباح الدین عبد الرحمٰن ایم، اے

ضخامت ۲۰۰ صفحے ۔ قیمت :۔ ہے

منیجر

کرامت علی خاں شہیدی

از جناب ڈاکٹر لطیف حسین صاحب ادیب

نام کرامت علی خاں، تخلص شہیدی، موضع ٹڑیاپوری ضلع اناؤ کے رہنے والے تھے، بعض تذکرہ نویسوں نے آپ کو لکھنؤ[1] اور بعض نے موضع دائرہ پور کا باشندہ لکھا ہے[2]، ایک فاضل محقق کی رائے ہے کہ وہ بریلی کے باشندے تھے[3]،

دیوان شہیدی مطبوعہ تقریباً ۱۲۶۸ھ / ۱۸۵۱ء میں درج ہے، "منشی کرامت علی خاں ٹڑیاپوری اناوی متخلص بہ شہیدی، متوفی ۱۲۵۶ھ ....." اس لیے ہمارے خیال میں شہیدی کا منشاء مولد موضع ٹڑیاپور ضلع اناؤ تھا، ملازم لکھنؤ میں رہے اور عمر کا آخری حصہ بریلی میں گزرا۔

شہیدی کے والد کا نام عبد الرسول خاں تھا، وہ بھی شیریں کلام شاعر اور علم عروض میں دستگاہ کامل رکھتے تھے، راجہ ٹکیت رائے کے فارسی کلام پر اصلاح دیتے اور معلم گیری کے ذریعے بسر اوقات کرتے تھے، شہیدی کی ابتدائی تعلیم و تربیت کے متعلق تذکرہ نویس خاموش ہیں، قیاس ہے کہ انھوں نے حسب دستور مکتب میں مروجہ درسی کتابیں پڑھی ہوں گی، پھر اپنے والد کی نگرانی میں دوسرے علوم کی تکمیل کی ہوگی۔

تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ وہ حساب و عروض کے ماہر تھے، شہیدی اٹھارہ سال کی عمر میں لکھنؤ آئے، ایک روایت کے مطابق وہ لکھنؤ کمسریٹ میں ملازم ہوئے، اور دوسری روایت کے بموجب منشی گیری کے عہدہ پر مقرر ہو کر ایک انگریز کے ساتھ دہلی گئے، شہیدی کے متعلق چند دلچسپ باتیں مشہور ہیں،

---

[1] بزم سخن ص ۶۵ از سید علی حسن خاں [2] انتخاب زریں از سرور اس مسعود ص ۳۶ [3] تاریخ ادب اردو ۱۹۵۳ء ص ۱۰۶ از ڈاکٹر محی الدین قادری زور

کریم الدین پانی پتی نے لکھا ہے[1] "ابتدا میں ایک لڑکے مسمی گنگا پرشاد پر عاشق تھا، اس واسطے بجائے یا فتاح کے ہر ایک کتاب پر جو شہیدی کی ملک سے تھی، یا گنگا پرشاد لکھ دیا تھا۔" اس روایت کو گارساں دتاسی اور سری رام دونوں ہی نے نقل کیا ہے[2]، مولف مہر جہاں تاب نے لکھا ہے کہ شہیدی کمسریٹ لکھنؤ میں ملازم تھے، اور انھیں خیانت مجرمانہ کے جرم میں ماخوذ ہونے کا خوف تھا، اس لیے انھوں نے اپنی زندگی میں انقلاب پیدا کیا، اور ہندوستان سے حجاز کی طرف سفر کیا اور مدح جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں اپنا مشہور قصیدہ لکھا، مولانا عبدالسلام ندوی نے بھی مہر جہاں تاب کے حوالے سے اس واقعہ کا ذکر کیا ہے[3]، واقعات کچھ بھی رہے ہوں ہمیں ان کی تحقیق کی ضرورت نہیں ہے، اس لیے بقول شخصے ایک پارسا اور ایک گنہگار میں فرق صرف اتنا ہوتا ہے کہ پارسا کا ایک ماضی ہوتا ہے اور گنہگار کا ایک مستقبل، شہیدی کا بھی ایک ماضی تھا، ان میں عشق کا مادہ زیادہ تھا، اور عشق پسند طبیعتوں کی خودداری و نامرادی، بیزاری و فراخدلی ان میں بھی تھی، شیفتہ کا یہ بیان کہ شہیدی مرد بے تکلف، وارستہ مزاج، وسیع المشرب اور آزادانہ زندگی بسر کرنے والا تھا[4]، ان کی عشق پسند طبیعت کی ایک قوی شہادت ہے، کیونکہ یہ خصوصیات راہ عشق کے منزل رسوں میں ہی پائی جاتی ہیں۔

شہیدی جہاں گشت قسم کے انسان تھے، وہ پنجاب اور گجرات تک گئے، کبھی کبھی دہلی بھی جانا ہوا، جہاں شیفتہ سے ملاقات رہی، مولف طور کلیم نے لکھا ہے کہ وہ بھوپال بھی گئے تھے[5]، آخر عمر میں شہیدی کا قیام بریلی میں رہا، یہاں وہ نواب محمد عطا حسین عطا[6] کے مہمان ہوئے، شہیدی نے

---

[1] طبقات الشعرائے ہند (قلمی) ص ۳۸۶ - نسخہ رامپور [2] خمخانۂ جاوید ج ۵ ص ۲۱۷ [3] شعر الہند ج ۲ ص ۱۹۸
[4] گلشن بیخار (قلمی) ص ۱۵۳ نسخہ رامپور [5] ص ۵۹ [6] آپ ایک سخن فہم و سخن سنج رئیس تھے، شہیدی کے علاوہ امیرالدین آزاد اور محسن علی خاں جوش بھی آپ کے دربار سے وابستہ تھے، میرے پاس ایک قلمی بیاض ۱۲۴۴ھ / ۱۸۲۸ء محفوظ ہے جس میں شہیدی، آزاد اور جوش کے علاوہ عطا کا مختصر کلام بھی درج ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اردو و فارسی
(باقی حاشیہ ص ۴۵ پر)

نواب صاحب کی مدح میں اکیس[1] شعر لکھے جو کلیات شہیدی میں سلسلۂ تاریخ مثنوی محمد عطا حسین طبع ہو چکے ہیں

ہزاروں گنج لعل و دُر لٹایا — عطا جب نام اس حاتم نے پایا
شہیدی تو بھی اس در کا گدا ہے — کہہ آمین دل سے یہ وقت دعا ہے
زمین و آسمان جب تک ہو قائم — خداوندا ہو اس کا عیش دائم
ستارہ بخت کا بیت الشرف میں — ہمیشہ دامن مقصود کف میں

شہیدی ان چند خوش نصیب شاعروں میں ہیں جن کا دیوان بار بار چھپا، جو اس کی مقبولیت کا ثبوت ہے، شہیدی کے جتنے دیوان میری نظر سے گذرے ہیں، ان کی تفصیل یہ ہے:

(۱) کلیات شہیدی۔ یہ عبدالغنی سوداگر بریلی کی فرمائش اور شیخ مددعلی کے زیر اہتمام ۱۲۷۰ھ / ۱۸۵۳ء میں مطبع آئینہ سکندر، میرٹھ میں چھپا تھا، تعداد صفحات ۶۸ اور مروجہ دیوانوں کے بقدر کلام پر مشتمل ہے، البتہ اس کے آخر میں قطعات تاریخ درج ہیں، جو دوسرے دواوین میں نہیں ملتے۔

(۲) دیوان شہیدی۔ (رضا لائبریری رامپور) اس کا سائز چھوٹا اور تعداد صفحات ۲۱۲ ہے، چونکہ شروع اور آخر کے صفحات نہیں ہیں، اس لیے یہ نہیں بتایا جا سکتا کہ کب اور کہاں چھپا۔

(۳) دیوان شہیدی (نولکشور پریس لکھنؤ) اس کے صفحات ۱۰۸ اور سال طباعت ۱۸۸۱ء ہے، یہ پہلا اڈیشن ہے۔ اس کے بعد تین اڈیشن اور نکلے، آخری اڈیشن ۱۹۱۳ء کا ہے۔

(بقیہ حاشیہ ص ۴۴) میں طبع آزمائی کرتے اور غزل، ہجو، قصیدہ، مثنوی ان کی خاص فتوحات میں شامل تھیں، نواب صاحب عطا کا بریلی میں مکان تھا، محلہ قلعہ نزد جامع مسجد تھا، بعد وفات آپ جامع مسجد میں دفن ہوئے۔

[1] متذکرہ بالا بیاض ۱۲۴۴ھ میں شہیدی کی کئی غزلیں درج ہیں، اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ نواب عطا حسین نے خود یا کسی دوسرے شخص سے بیاض میں وہ غزلیں نقل کرائیں جو ان کے دربار سے وابستہ شعراء کا کلام تھا تو شہیدی کا ۱۲۴۴ھ میں بریلی میں موجود ہونا قرین قیاس ہے، نواب عطا حسین صاحب کی اولادوں میں سے ایک بزرگ نواب کبیر حسین نے مجھے بتایا کہ خاندانی معلومات کے بموجب شہیدی کا بریلی میں قیام مدت تک رہا اور ان کے جد امجد نواب عطا حسین نے شہیدی کو ایک مکان بغرض رہائش عطا کر دیا تھا، یہ مکان ایک کھنڈر کی صورت میں ہنوز موجود ہے، لہذا میرا خیال تو یہی ہے کہ شہیدی کی بریلی میں کم سے کم مدت قیام بارہ سال یعنی ۱۸۲۸ء تا ۱۸۴۰ء ہے۔

اس طرح دیوان شہیدی میرے علم میں چھ بار طبع ہوا، کریم الدین پانی پتی نے طبقات الشعرائے ہند میں لکھا ہے "شہیدی کا ایک دیوان بہت بڑا ہے، میں نے وہ دیوان اس کے ایک قریبی رشتہ دار کے پاس دیکھا تھا، اس کا ارادہ لکھنؤ میں چھپوانے کا تھا، یقین ہے کہ لکھنؤ بھیجدیا ہوگا، شہیدی نے بہت قصیدے اور ہر ایک قسم کے شعر کہے ہیں،[1]" مذکورۂ بالا دواوین میں بہت سے قصیدے نہیں ہیں، اور اگر ہر ایک قسم کے شعر سے مراد مختلف اصناف سخن ہیں تو وہ بھی دواوین میں نہیں ہیں، رضا لائبریری رامپور میں دیوان شہیدی کا ایک قلمی نسخہ بھی ہے (تقریباً ۱۲۶۸ھ ۱۸۵۱ء) جس کی تعداد صفحات صرف ۸، ہے۔

فن شاعری میں شہیدی پہلے مصحفی، پھر نصیر دہلوی کے شاگرد ہوئے، اس سلسلے میں ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ مصحفی نے ریاض الفصحا[2] میں شہیدی کا ذکر نہیں کیا ہے، حالانکہ فرد جیسے نو عمر اور حقیقت ع "بے حقیقت مصحفی کا چور ہے" کو بھی شامل کرلیا ہے، میرا خیال ہے کہ شہیدی نے مصحفی کی شاگردی اس وقت اختیار کی جب تذکرے میں ان کی شمولیت ممکن نہیں تھی، یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ۱۲۳۶ھ ۱۸۲۱ء اور ۱۲۴۰ھ ۱۸۲۴ء کے وقفے میں جو تذکرے کی تکمیل اور مصحفی کی موت کا درمیانی زمانہ ہے، وہ مصحفی کے شاگرد ہوئے ہوں اور اس وجہ سے شامل تذکرہ نہ ہوسکے، بہر حال وہ مصحفی کے تلامذہ میں ہیں، دہلی کی آمد و رفت کے ایام میں جب کہ شاہ نصیر دکن سے واپس آچکے تھے، انھوں نے اپنا کلام نصیر کو بھی دکھایا تھا، انکی شاعری میں نصیر کا طرز غزل گوئی بعض مقامات پر نمایاں ہے،

شہیدی بندۂ عشق تھے، ہمارے پاس کوئی ایسی شہادت تو نہیں ہے کہ قطعیت کے ساتھ یہ کہہ دیں کہ کسی متعین ذات سے ان کو عشق تھا، لیکن یہ حقیقت ہے کہ عشق ان کی زندگی تھا، ان کے ہی الفاظ میں عشق نے ان کی عقل کو اس طرح گھبرا لیا تھا جیسے مست کسی ہشیار سے چپٹ جاتا ہے ؎

عشق نے یوں عقل کو گھبرا لیا مست چمٹے جس طرح ہشیار سے

اور

عشق میں سب سے ہو شہیدی دو چند خلق کو آدھا گنو سارا مجھے

[1] نسخۂ رامپور ص ۳۰۶ - ۳۰۷ [2] مطبوعہ ۱۹۳۴ء باہتمام انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن

اس دعوی کے ساتھ انھوں نے اپنی شاعری کے متعلق بھی کہا ؎

میرے دیواں کو تماشا کر نگاہ غور سے ہر ورق ہے اک مرقع یار کی تصویر کا

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شہیدی ناآسودہ عاشق نہیں تھے، ان کے کتنے ہی اشعار کا محاکاتی پہلو اور تصویر آفرینی، واقعات نگاری و لذت کشی بتاتے ہیں کہ وہ کسی محفل نشیں سے وابستہ رہے ہیں، مثلاً

سر سے قدپہ اٹھا ہاتھ جو انگڑائی کو مستزاد اس نے کیا مصرعۂ رعنائی کو

یاد آتا ہے شب عشرت میں اینٹھ و ٹھنا اس کا جھنجھلا کر وہ کہنا تو بھی اس قابل ہوا

غیر کے کہنے پہ ناداں مجھ سے بدظن ہوگیا جھوٹ کو بھی کیا اثر ہے دوست دشمن ہوگیا

ہو جائے گا چپ سن کے مرا حرف تمنا ناداں ہے اسے اور بھی مغرور کروں کیا

شرم آتی ہے وگرنہ ان بتوں کی ضد سے میں جیتے جی اللہ سے اک حور جنت مانگتا

لیکن یہ لطف زندگی عارضی تھا، ان میں ایسا انقلاب ہوا کہ عاشق وہ اب بھی تھے مگر تبدیلی کے ساتھ ؎

فقر میں شاہد پرستی کب شہیدی سے چھٹی شاہ ہندوستاں کا ان کاموں میں گھر جاتا رہا

وہ کمل پوش فقیر ہوگئے ؎

کشتہ بہروپ کا اسکے ہوں شہیدی کہ وہ شوخ جلوہ فرما ہے میری چشم میں ہر آن نیا

تیرے خرقے نے چھپایا ہے شہیدی تجھ سے یار بے عیب کو پردہ نہیں عریانوں سے

جب زندگی میں اچانک کوئی تبدیلی پیدا ہوتی ہے تو عام لوگ اس سے فوراً مانوس نہیں ہوتے کوئی اچھا کہتا ہے کوئی برا، شہیدی کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا، بعض لوگ اس تبدیلی کے قائل نہیں ہوئے اور علانیہ کہا ؎

شہیدی کو نہ پایا ریش داروں کی محافل میں رہے مشغول اکثر سادہ رویوں کج کلاہوں سے

شہیدی نے اس کے جواب میں کہا ؎

دلیل اتقا ہے مجھ سے ہم بزمی فرشتوں کی
اگر فاسق ہوں البتہ ہو صحبت روسیاہوں سے

مختصر یہ کہ ان کی تمام زندگی عشق کے سانچے میں ڈھل گئی، غم مہجوری اور غم حیات کا ایسا ساتھ رہا کہ وہ غم کو مایۂ حیات سمجھنے لگے۔ اہل جہاں سے بیزاری کا مادہ پیدا ہوگیا، مگر اس عالم میں وہ خود سے کبھی بیزار نہ ہوئے اور نہ کبھی اپنے وجود کو کم مایہ سمجھا، غم عشق کی کیفیات نے کمل پوشی کے باوجود صوفیانہ پیرایہ اظہار اختیار نہیں کیا، وہ عملاً فقیرانہ زندگی کرتے، اگر تصوف میں رچے بسے ہوئے شعر کہتے تو اس کی بڑی پذیرائی ہوتی، تاہم لوگ ان کی کرامت کے قائل ہونے لگے، مگر شہیدی نے تصورات کے بجائے غم عشق کی مختلف کیفیات کو اپنایا، یہ ان کے دل کا ابال تھا، اور یہی انکی شاعری کا بہترین نمونہ ہے، ؎

دل کے جانے کا شہیدی حادثہ ایسا نہیں
کچھ نہ روئے آہ اگر ہم عمر بھر رویا کیے

سینے پر برچھے لگائے جیسے بیٹھا ہو کوئی
وہ مری صورت دل مرحوم کے ماتم نے کی

ہم نے آنکھیں موند لیں دنیا کا پردہ کھل گیا
بیٹھے ارباب بصیرت جام جم دیکھا کریں

تغیر حال میں اپنے رہیگا شام محشر تک
ابھی سے پوچھنا بیجا ہے انجام اس کہانی کا

دل نے رسوا جا بجا سو ہم کو کیا
دربدر اور کو بکو ہم کو کیا

خود بخود آتا ہے گریہ ہر گھڑی
عاشقی نے طفل خو ہم کو کیا

اے شہیدی شوق وصل یار نے
جسم و جاں سب آرزو ہم کو کیا

عیدیں بھی ہوتی رہیں نوروز بھی ہوتے رہے
ہے وہی عالم ہمارے نالۂ ناشاد کا

اندوہ دائمی میں کٹے کس خوشی سے عمر
گر مجھکو غم نہ ہو طرب گاہ گاہ کا

برباد ہوگیا میں شہیدی بقول میر
خانہ خراب ہو جیو اس دل کی چاہ کا

اوروں کو فکر ہے نہ ہوائے مال جمع
ہم کو یہ غم رہا کہ قلندر نہ ہو سکے

سائے کو افتادگی میں بحث ہے
میرے ویران خانے کی دیوار ہے

ناکامیٔ جاوید کی ہم مانتے منت
افسوس شہیدی تری تربت نہیں ملتی

شمع مردہ کو جو محفل سے نکلتے دیکھا
بوئے بد آئی مجھے عیش کے سامانوں سے

کہتے ہیں اشک ندامت سے ہو تخفیف گناہ
ہم جو روئے اور بھی تر اپنا دامن ہوگیا

ایک ہے حسرت و امید مرے مذہب میں
جب سے طالب ہوں ترا کچھ مجھے مطلوب نہیں

منزل کفر و دیں ہے ایک گو ہیں جدا جدا طریق
راہ نہ اس دوراہے میں پوچھ کہ دونوں ہیں ایک رو

گر شرح کروں اپنی شب غم کی اذیت
تقریر کو محشر کے ہوں درکار کئی دن

احباب سے دیکھی نہ وفا ہم نے شہیدی
شرمندہ رہے شفقت اعدا کے ہمیشہ

ایام مصیبت کے تو کاٹے نہیں کٹتے
دن عیش کی گھڑیوں میں گذر جاتے ہیں کیسے

کیوں دل سے نہ مٹ جائیگا اندیشۂ حرماں
جب ہم نے یہ ٹھانی کہ تمنا نہ کریں گے

شہیدی اتنی گماں پرستی نشہ میں سب بھول بیٹھے ہستی
ہوئی ہے اس مے سے ہم کو مستی جو تا گلو بھی نہیں گئی ہے

شہیدی کے متعلق یہ تصور قائم کرلینا کہ وہ آورد و تکلف سے دور تھے، صحیح نہیں ہے، یہ ضرور ہے کہ انھوں نے آورد و تکلف کو مشغلۂ شاعری نہیں بنایا، حالانکہ ان کے ذہنی بلوغ کے زمانے میں مرصع سازی کمال فن سے تعبیر کی جاتی تھی، دربارداری، حریفانہ چشمکیں، مشاعروں میں مسابقت کی کوشش شاعری کے پیشہ کے لیے ناگزیر سے ہوگئے تھے، شہیدی کو ایک جوہر قابل کی طرح اپنی اہمیت کا احساس تھا، اور انھوں نے اپنی استادی جتانے کے لیے سنگلاخ زمینوں میں غزلیں لکھیں جن میں جوانی کی جولانیاں بھی تھیں، ایسی غزلیں بھی لکھیں اور ایسے تخیلات کو بھی جگہ دی جو بے اثر اور دوراز کار تھے مثلاً

کلی انار کی رکھتا ہے آرسی پہ کیا
ابھی کھلے گا ترا موسم جوانی رنگ

ہر ایک رنگ میں ہر رنگ کی ہے بو پنہاں
چڑھے نہ رنگ زروں سے بغیر پانی رنگ

سو نہ دو تم دو ہی دو بوسے ولے اک ڈھب کے دو
قول ہے مشہور یہ مطلب کے سو مطلب کے دو

وہ ہی دوپردہ اجی وہ بھی شتابی دو کھینچ | خال کے وہ خط کے وہ رخسار کے وہ لب کے دو

جیسی تصویر میں شنجرف کی مد ہوتی ہو | غنچۂ لب جائے دہن سرخی پان رکھتے ہیں

ذوق پرواز ہو کیا طوطی خط کی مانند | آشیاں باغ میں ہم فصل خزاں رکھتے ہیں

جیسا کہ میں اوپر اشارہ کر چکا ہوں شہیدی کی یہ غزلیں عصری حالات کا نتیجہ تھیں، ورنہ انکا اصلی رنگ دوسرا تھا، جو ان کی شاعرانہ عظمت کا شاہد ہے۔ مثلاً ؎

عمر بھر عشق کے آزار نے سونے نہ دیا | ہائے ہائے دل بیمار نے سونے نہ دیا

نالہ کش ایک رہا ایک کراہا تا صبح | جان ریش و دل افگار نے سونے نہ دیا

رت جگے ہوتے رہے ہیں کہ بڑھے غم کی عمر | ایک شب درد دل زار نے سونے نہ دیا

نیش غم نے رگ مژگاں سے نکالا یہ لہو | مجکو راتوں مرے غمخوار نے سونے نہ دیا

لیکن شہیدی کی شہرت اور شاعرانہ عظمت ان کی نعتوں کی وجہ سے ہے جس کی تفصیل آگے آتی ہے۔

اردو ادب میں نعت و منقبت اردو شاعری کی طرح قدیم ہیں، چنانچہ اردو نعتیہ شاعری کے ابتدائی نمونے دبستان دکن میں ملتے ہیں، شمالی ہندوستان میں بھی نعت و منقبت کا آغاز ہوا مگر تبرکاً۔ ان میں بھی نعت کے مقابلے میں منقبت پر زیادہ زور دیا گیا، جو لکھنؤ کے شیعہ ماحول کے زیر اثر تھا، میر اور سودا کے یہاں نعت کم اور منقبت زیادہ ہے، یہی حال انشا کا ہے، انھوں نے بھی منقبت ہی پر زیادہ زور قلم صرف کیا، اس زمانہ میں نظیر اکبر آبادی، شہیدی، لطف علی خاں لطف[1]، کفایت علی کافی[2]،

[1] آپ کا وطن بریلی تھا، ایک نعتیہ دیوان آپ کی یادگار ہے، زندگی بھر نعت ہی لکھی اور دنیاوی مال و متاع رکھنے کے باوجود دنیاوی جاہ و حشمت سے بے نیاز رہے، آپ کا بعمر ۹۰ سال ۱۸۶۶ء میں انتقال ہوا، اور تکیہ کالے شاہ بریلی میں دفن ہوئے، قبر پختہ ہنوز محفوظ ہے۔ [2] ساکن مرادآباد، شاگرد ذکی مرادآبادی، مشہور نعت گو اور جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے ایک سپاہی تھے، انگریزوں نے آپ کو باغی قرار دیا اور ۱۸۵۸ء میں مرادآباد میں ہی مجمع عام کے سامنے پھانسی دیگئی، وہ پھانسی کے وقت اپنی ایک غزل

اور غلام امام شہید علی الترتیب نعت و منقبت کے شاعر مانے جاتے ہیں، نظیر اکبرآبادی نے منقبت کے علاوہ نعت بھی لکھی مگر اس میں ان کی کوئی امتیازی شان نہیں ہے، لطف نے نعت گوئی کو اپنی زندگی کا مشن بنا لیا اور دو دیوان مرتب کیے، ایک دیوان ان کی زندگی میں ہی ضائع ہو گیا، اور دوسرا ۱۲۷۰ھ/۱۸۵۳-۵۴ء میں طبع ہوا، انکی نعتیں غزل کے فارم میں ہیں، کافی کی شخصیت زیادہ ہمہ گیر تھی، انھوں نے نہ صرف ایک نعتیہ دیوان یادگار چھوڑا بلکہ احادیث کی منظوم شرح، ستون حنانہ کا منظوم واقعہ، مولود بہاریہ، شمائل ترمذی کا منظوم ترجمہ، اور مثنوی تجمل دربار رحمت بار نبی صلی اللہ علیہ وسلم وغیرہ بھی یادگار چھوڑیں، وہ شمالی ہند کے پہلے نعت گو ہیں جنھوں نے نعت گوئی کے مقدس فریضے کو زیادہ وسعت اور زیادہ فکر کے ساتھ ادا کیا، غلام امام شہید کے مولود شریف شہید میں زیادہ نعتیں فارسی میں اور چند اردو میں ہیں، البتہ روایت استن حنانہ، قصہ حضرت حلیمہ سعدیہ اور قصہ حضرت بلال تین مثنویوں کی شکل میں ہیں، اور ایک سلام اور ایک ترجیع بند بھی اردو میں ہے، وہ دراصل فارسی کے شاعر تھے، اس لیے اپنی شاعری کا بڑا سرمایہ فارسی ہی میں چھوڑا، محسن کاکوروی، رضوان[1] مرادآبادی، مذاق[2] بدایونی، حسن بریلوی، امیر مینائی اور ناصر[3] سہارنپوری متذکرۂ بالا اساتذہ کے بعد شمار کیے جاتے ہیں، اور حق تو یہ ہے کہ فن نعت گوئی

(بقیہ حاشیہ ص ۵۰) پڑھ رہے تھے جس کے دو شعر یہ ہیں:-

کوئی گل باقی رہے گا نے چمن رہ جائیگا | پر رسول اللہ کا دین حسن رہ جائے گا

سب فنا ہو جائیں گے کافی ولیکن حشر تک | نعت حضرت کا زبانوں پر سخن رہ جائیگا

[1] نام محمد رضوان علی خاں، شاگرد غالب، نعت کے مشہور شاعر تھے، آپکا کلیات "تصویر خوبی" ۱۹۰۷ء میں چھپ چکا ہے، ۱۹۱۱ء میں وفات پائی، [2] بدایوں کے مشہور صاحب باطن بزرگ تھے، ۱۸۳۶ء میں ذوق کے شاگرد ہوئے، بیسیوں کتابوں کے مصنف ہیں، آپکا مجموعۂ کلام ۱۳۱۴ھ/۱۸۹۶ء میں دکٹوریہ پریس بدایوں میں طبع ہوکر شہرہ ہوا، انتقال بدایوں میں ہوا اور ساغر تال سے کچھ پیچھے آنولہ روڈ پر جانب شرق دفن ہوئے۔ [3] سلسلۂ صابریہ کے مشہور بزرگ اور نعت و منقبت کے شاعر ہیں، تقریباً ۱۲ مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کتابیں آپکی یادگار ہیں جن میں نعت و منقبت کے مجموعے، کلیات اردو اور کلیات فارسی شامل ہیں، آپکا مولد و منشا سہارنپور تھا، انتقال بریلی میں ہوا اور مسجد نو محلہ میں دفن ہوئے۔

میں یہ سب افضل و ممتاز ہیں۔

نعت کے لیے کسی فارم کے تعین کی ضرورت نہیں، نعت غزل کے نام میں بھی لکھی گئی اور قصیدے کے بھی، نعتیہ خمسہ جات بھی لکھے گئے اور مسدس بھی، البتہ اتنا فرق واضح رہا کہ نعتیہ قصیدہ میں قصیدے کی شان و شوکت اور نعتیہ غزل میں غزل کی سادگی اور مٹھاس برقرار رہی، بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ نعت میں نہ صرف غزل کی سادگی اور مٹھاس برقرار رہی بلکہ بعض شاعروں کے یہاں آورد بھی ہے، جو ایک فطری عمل تھا، نعت جس صنف سخن میں لکھی گئی اس کے اثرات نعت پر مرتسم ہوئے، جب وہ غزل کے فارم میں لکھی گئی تو اس میں آمد کے علاوہ آورد و مینا کاری کے نقش بھی تھے، اگر ایک طرف نعتیہ غزل میں جذبات کی گرمی، خلوص کا نکھار اور والہانہ محبت کا بےساختہ پن تھا، تو دوسری طرف عارض و گیسو اور چشم و گردن کی توصیف بھی تھی، اس لحاظ سے اول الذکر نعت تھی اور آخر الذکر محض شاعری، مگر اس کے باوجود ہم نعت گو کی نیت پر شبہہ نہیں کر سکتے، محبوب العالمین حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت ہر مسلمان کا ایمان ہے، اور آپ کے عارض و گیسو کی توصیف محض شاعری ہی سہی لیکن اس میں محبت کا بھی کچھ نہ کچھ حصہ ضرور ہوتا ہے، اس لیے وہ محض شاعری ہوتے ہوئے بھی نعت کے قریب ہے، ورنہ بقول مولانا عبد الماجد دریابادی "اگر نقد و گرفت شروع ہو جائے تو سلف سے ابتک بڑے بڑے نامور نعت گو شاعر کیا فارسی کے اور کیا اردو کے مجرموں کے کٹہرے میں کھڑے نظر آئیں گے۔ پھر شاعری آخر شاعری ہے، کتاب العقائد تو بہرحال نہیں۔"[1]

شہیدی نے نعتیہ قصیدے، نعتیہ غزلیں اور نعتیہ خمسے لکھے، ان نعتوں میں قصیدے کی شان غزل کی آمد اور آورد اور خمسے کی برجستگی ہے، ان کے نعتیہ قصیدے فن قصیدہ کے معیار پر پورے اترتے ہیں، ان کی نعتیہ غزلوں میں جذبات نگاری بھی ہے اور عارض و گیسو کی توصیف بھی ہے، کیونکہ وہ نعت گو ہی نہیں ہیں بلکہ ایک شاعر بھی تھے، اور ان کی شاعری ان کے ماحول کے زیر اثر تھی، ان کی

[1] پیش لفظ آہنگ حجاز

نعت کا مختصر انتخاب یہ ہے

بادشاہی سے تو بہتر ہے مجھے رنج کشی
شہد بہتر سے بھی شیریں ہے مجھے تلخ چشی

عقل کل کی ہے تمنا مری دیوانہ وشی
ہے حبیب عربی مدنی قرشی

کہ بود درد و غمش مایۂ صد عیش و خوشی

حق سے سائل ہوں دو عالم کے جو ہوں محتشمی
مدعا اس کی غلامی میں ہے ثابت قدمی

اس سے بڑھ چلنے میں ہے اپنی فراست کی کمی
فہم رازش چہ کنم او عربی من عجمی

لاف مہرش چہ زنم او قرشی من حبشی

جب عدم خانے میں ہستی کا کھلا روشنداں
نور اول سے ہویدا ہوئے افراد جہاں

اپنے مرکز کی طرف ہوتی ہے ہر چیز رواں
ذرہ وارم بہوا داری او رقص کناں

تا شدہ او شہرۂ آفاق بہ خورشید وشی

جائے جادہ ہو شہیدی دم خنجر ہر چند
رگ گردن سے چلیں اور رسیں صفت لب خند

مولوی نے تجھے دی نام سے اپنے پند
جامی ار ارباب وفا جز رہ عشقش نروند

شرم بادت گر ازیں راہ قدم باز کشی

ان کے رخ صبیح پہ زلفیں ہیں مشک فام دو
قدرت حق کو دیکھئے ایک سحر شام دو

ایک نبی کے ہاتھ سے ایک علی کے ہاتھ سے
کوثر و سلسبیل کے ہم کو ملیں گے جام دو

حق نے اسے کیا سلام اس نے ہمیں دیا سلام
ہم نے بھی لے لیا سلام شوق سے یہ سلام دو

ہے سورۂ والشمس اگر روئے محمد
واللیل کی تفسیر ہوئی موئے محمد

جب روئے محمد کی نظر آئی تجلی
سمجھا کہ شب قدر ہے گیسوئے محمد

کس وضع اٹھائے ہوئے ہیں بار دو عالم
ظاہر میں تو نازک سے ہیں بازوئے محمد

گلگشت گلستاں میں پڑھو صلِّ علیٰ تم | ہر پھول کی بو میں ہے رچی بوئے محمد
رضواں کے لیے لے چلوں سوغات شہیدیؔ
گر ہاتھ لگے خار و خسِ کوئے محمدؐ

شہیدیؔ کو حیاتِ جاویدان کے مشہور نعتیہ قصیدے نے بخشی جس کے چند شعر یہ ہیں۔

رقم پیدا کیا کیا طرفہ بسم اللہ کی مد کا | سر دیوان لکھا ہے میں نے مطلع نعتِ احمد کا
طلوعِ روشنی جیسے نشاں ہو شہ کی آمد کا | ظہورِ حق کی حجت ہے جہاں میں نورِ احمد کا
شرف حاصل ہوا آدم اور ابراہیم کو اس سے | نہ تنہا فخرِ عالم فخر تھا اپنے اب و جد کا
ادھر اللہ سے واصل اُدھر مخلوق سے شامل | خواص اس برزخِ کبریٰ میں ہے حرفِ مشدّد کا
ترے پابوس سے ہفتم فلک پر منزلِ کیواں | ترے سجدے سے ہشتم آسماں پر فوق فرقد کا
ہوئی ہے ہمتِ عالی مری معراج کی طالب | میسر ہو طواف اے کاش مجھکو تیرے مرقد کا
تمنا ہے درختوں پر ترے روضے کے جا بیٹھے | قفس جس وقت ٹوٹے طائرِ روحِ مقید کا

خدا منہ چوم لیتا ہے شہیدیؔ کس محبت سے
زباں پر میری جس دم نام آتا ہے محمدؐ کا

اس قصیدے کے متعلق حضرت عزیز صفی پوری[1] نے لکھا ہے "مولوی فضل رسول بدایونی[2] اور شہیدی سے راہ و رسم تھی۔ ایک دن مولوی فضل رسول کو انھوں نے ایک غزل سنائی اسکا مطلع پورا پورا مجھکو یاد نہیں رہا[3]، ایک مصرع یاد ہے، ع ابھی تو نام خدا ہے غنچہ نسیم چھو بھی نہیں گئی ہے۔ یہ مصرعہ دوشیزگی کی صفت میں ہے۔ مولوی فضل رسول علیہ الرحمہ نے غزل سنکر کہا تم نے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم

[1] سوانح اسلاف قلمی ص ۷۵۱۔ مملوکہ جناب خصلت حسین صابری کراچی [2] سلسلۂ قادریہ کے ایک بزرگ اور بوارق محمدیہ کے مصنف المتوفی ۱۲۸۹ھ [3] مصرع اولیٰ یہ ہے ع مشامِ بلبل میں رشکِ گل کی ہنوز بو بھی نہیں گئی ہے۔

کی شان میں کچھ کہا ہے، یہ سنکر آہ سرد کھینچی کہ میں آپ کی تعریف میں کیا کہہ سکتا ہوں، مولوی فضل رسول صاحب نے پھر کہا، یہ وہاں سے اٹھکر اپنی قیام گاہ پر گئے اور دوسرے وقت قصیدہ کہکر لے آئے، اس کا مطلع یہ ہے:

طلوعِ روشنی جیسے نشاں ہو شہ کی آمد کا | ظہورِ حق کی حجت ہے جہاں میں نورِ احمد کا

اس میں شک نہیں کہ یہ قصیدہ صنفی و معنوی اعتبار سے فن قصیدہ نگاری کا اعجاز ہے، یہ قصیدہ اس قدر مشہور اور مقبول ہوا کہ کتنے ہی اساتذہ نے اس زمین میں قصیدے لکھے، جن میں امیرؔ مینائی، محسنؔ کاکوروی، عزیزؔ صفی پوری، ناصر الدین احمد ناصرؔ[1] اور ولدار علی مذاقؔ بدایونی[2] کے قصائد اور خمسے میری نظر سے گذر چکے ہیں، ان تمام قصائد کا تقابلی جائزہ خود اپنی جگہ ایک دلچسپ ادبی مشغلہ ہے، شہیدیؔ کے مذکورہ قصیدے اور دیگر نعتوں کی مقبولیت نے نعت گوئی کا ماحول پیدا کر دیا، محسنؔ و امیرؔ، مذاقؔ و ناصرؔ اور دیگر نعت گویان اردو ایک سلسلے کی مختلف کڑیاں ہیں جس میں اولیت شہیدیؔ کو حاصل ہے۔ شہیدیؔ کے دم سے اردو نعت گوئی میں ایک رفتار پیدا ہو گئی، اور اس وقت اردو نعت کا خاصہ سرمایہ دعوت مطالعہ دے رہا ہے۔

شہیدیؔ کی وفات چہارم صفر ۱۲۵۶ھ ۱۸۴۰ء کو مدینہ منورہ میں ہوئی، حضرت عزیز صفی پوری نے اس واقعہ کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے، "جب جہاز پر سوار ہوئے، شہیدیؔ کو بخار آنے لگا اور دست بھی آنے لگے، جب مکہ معظمہ ہوکر مدینہ منورہ کے قریب پہنچے، تب مولوی صاحب سے کہا کہ جب گنبد شریف سامنے آئے تب مجھے ہشیار کر دیجیے گا، چنانچہ مولوی صاحب نے آگاہ کیا، گھبرا کر کہا مجھے جلدی نیچے اتار دیے، مولوی صاحب نے اتار کر سامنے کھڑا کیا، روضہ شریف کی طرف دیکھکر انتقال کر گئے۔ جنازہ مدینہ منورہ پہنچا، اور جنت البقیع میں دفن ہوا، انکی آرزو پوری ہو گئی۔"

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

[1] آپ سلسلۂ صابریہ کے مشہور بزرگ اور نعت و منقبت کے شاعر تھے، تقریباً ۱۷ کتابیں مطبوعہ اور غیر مطبوعہ یادگار چھوڑیں جن میں نعت و منقبت کے مجموعے اور کلیات اردو اور کلیات فارسی شامل ہیں، آپ کا وطن سہارنپور تھا، انتقال ۱۳۴۶ھ میں بریلی میں ہوا، اور مسجد نومحلہ میں دفن ہوئے۔ [2] مدینۃ الاولیا بدایوں کے مشہور بزرگ ہیں، اور ۱۳ کتابوں کے مصنف ہیں۔ آپ کا کلیات ۱۳۱۴ھ میں بدایوں میں چھپ چکا ہے، بدایوں ہی میں ۱۸۹۲ء میں انتقال ہوا، ساغر تال سے کچھ پیچھے آنولہ روڈ پر جانب مغرب دفن ہوئے۔

امام بخاریؒ

اور

اُن کی جامع صحیح کی خصوصیات

از جناب مولوی تقی الدین صاحب ندوی استاد حدیث دار العلوم ندوۃ العلما

نام ونسب سلسلۂ نسب یہ ہے :۔ محمد بن اسماعیل ابن ابراہیم ابن مغیرہ بن بردزویہ، بردزویہ مجوسی تھے اور اسی مجوسیت پر ان کا انتقال ہوا۔ ان کے صاحبزادہ مغیرہ پہلے شخص ہیں جو امیر بخارا یمان جعفی کے ہاتھوں پر مشرف باسلام ہوئے، اسی نسبت سے امام موصوف جعفی مشہور ہو گئے، ورنہ جعفی خاندان سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔ (تہذیب التہذیب ص ۱۵۰)

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ امام موصوف کے دادا ابراہیم کی زندگی کے حالات معلوم نہیں ہو سکے[۱] (مقدمہ فتح الباری ص)۔ البتہ امام بخاری کے والد اسماعیل اپنے زمانہ میں طبقہ رابعہ کے مشہور محدث شمار کیے گئے ہیں، ان کے شیوخ میں امام مالک، حماد بن زید وغیرہ ہیں، لیکن عبد اللہ بن مبارک کی خدمت میں رہنے کا زیادہ موقع ملا تھا۔

امام بخاری فرماتے ہیں کہ میرے والد ابراہیم نے حماد بن زید کو دیکھا کہ انھوں نے عبد اللہ بن مبارک سے دونوں ہاتھ سے مصافحہ کیا، اور انھیں امام مالک سے بھی سماع حاصل ہے، اور عبد اللہ ابن مبارک امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے تلامذہ میں سے ہیں، لیکن تعجب ہے کہ حافظ ابن حجر نے اس کا کوئی تذکرہ نہیں کیا، (لامع ص ۴۰)

پیدائش اور ابتدائی حالات امام بخاری ۱۳ شوال نماز جمعہ کے بعد ۱۹۴ھ میں بخارا ہی میں پیدا ہوئے، بچپن میں نابینا تھے، لیکن والدہ کی دعا کی برکت سے آنکھیں روشن ہو گئیں، امام صاحب کی والدہ نے جب ان کے لیے دعا کرنا شروع کی تو خواب میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دیکھا، آپ نے فرمایا کہ تمھاری کثرت دعا کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے تمھارے لڑکے کی بینائی واپس کر دی، اس خواب کی صبح کو وہ واقعی بینا ہو گئے، (مقدمہ فتح الباری ص ۴۵۸)

امام صاحب کے والد اسماعیل کا بچپن ہی میں انتقال ہو گیا تھا۔ اور انھوں نے اپنی والدہ کے آغوش شفقت میں نشو ونما پائی، سولہ (۱۶) سال کی عمر میں امام موصوف نے عبد اللہ بن مبارک اور امام وکیع کی کتابوں کو حفظ کر لیا تھا، پھر اپنے بڑے بھائی اور والدہ کے ساتھ حج کے لیے گئے، بھائی تو بخارا واپس آگئے، اور امام موصوف نے حج سے فراغت کے بعد دو سال مکہ معظمہ میں قیام فرمایا، پھر اٹھارہ (۱۸) سال کی عمر میں مدینہ منورہ کا رخ کیا، اور وہاں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک کے پاس چاندنی راتوں میں قضایا الصحابہؓ والتابعین اور التاریخ الکبیر کی تصنیف کی، (مقدمہ فتح الباری ص ۴۷۵)

سماع حدیث کے لیے سفر حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ امام صاحب کے سفر کا آغاز ۲۱۰ھ سے ہوا، انھوں نے سماع حدیث کے لیے دور دراز مقامات کا سفر کیا، شام، مصر اور جزیرہ میں دو بار تشریف لے گئے، اور حجاز مقدس میں چھ سال قیام فرمایا، کوفہ و بغداد جو علماء کا مرکز تھا، بار بار گئے، اور بصرہ میں چار مرتبہ جانا ہوا، اور بعض دفعہ پانچ پانچ سال تک قیام کیا، ایام حج میں مکہ معظمہ چلے جایا کرتے تھے، حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ امام موصوف آٹھ مرتبہ بغداد آئے اور ہر مرتبہ امام احمد ابن حنبل بغداد کے قیام پر اصرار کرتے تھے (ارشاد الساری ص ۳۱)

[۱] اس کے خلاف جس شرح حدیث یا کتاب میں ہے وہ غلط ہے، ناسخ کی غلطی ہو یا مؤلف سے فروگذاشت ہو گئی ہے لامع ص ۶

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ اس کے باوجود امام صاحب نے امام احمد سے بہت کم روایت کی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ امام صاحب کو خود امام احمد کے مشائخ سے استفادہ کا موقع ملا تھا، اس لیے اخیر سفر میں امام احمد سے روایت کرنا بہت کم کر دیا تھا (کذا فی الارشاد ص ۷) علامہ ذہبی فرماتے ہیں کہ امام بخاری نے سب سے پہلے سماع حدیث ۲۰۵ھ میں شروع کیا اور اپنے شہر کے شیوخ سے استفادہ کرنے کے بعد ۲۱۰ھ سے انھوں نے سفر کا آغاز کیا، اس سلسلہ میں منیا پر کا بھی سفر کیا تھا اور وہاں بھی کچھ دنوں مقیم رہے تھے، (تذکرہ)

اساتذہ و شیوخ | امام بخاریؒ کے اساتذہ و شیوخ کی تعداد بہت زیادہ ہے، ان کا خود بیان ہے:-

كتبت عن ألف وثمانين نفساً — میں نے ایک ہزار اسّی آدمیوں سے حدیثیں
ليس فيهم الا صاحب حديث — لکھیں، ان میں سب کے سب محدث تھے
(مقدمہ فتح ص ۴۷۹)

لیکن یہ مسلّم ہے کہ ان کو اسحٰق بن راہویہ اور علی بن المدینی سے زیادہ فیض پہنچا تھا،

حافظ ابن حجر نے ان کے شیوخ کے پانچ طبقات قائم کیے ہیں،

۱- تبع تابعین، مثلاً محمد عبد اللہ الانصاری، ابو عاصم النبیل

۲- تبع تابعین کے وہ معاصر جنھوں نے کسی ثقہ تابعی سے حدیث کی روایت نہیں کی، جیسے آدم بن ایاس،

۳- امام صاحب کے اساتذہ کا یہ درمیانی طبقہ ہے، اس میں ان لوگوں کا شمار ہے جن کو کبار تبع تابعین سے اخذ حدیث کا موقع ملا، جیسے قتیبہ بن سعید، احمد بن حنبل اسحاق بن راہویہ،

۴- معاصرین اور ہم درس رفقا، جیسے محمد بن یحییٰ ذہلی، ابو حاتم رازی،

۵- وہ معاصرین جو امام صاحب کے تلامذہ کے صف کے تھے، لیکن ان سے بھی بعض مرتبہ انھوں نے روایت کی ہے، جیسے عبد اللہ بن حماد آملی وغیرہ،

ان محدثین سے استفادہ میں امام صاحب نے امام وکیع کے اس مقولہ پر عمل فرمایا ہے کہ آدمی اس وقت تک محدث نہیں ہوتا جب تک کہ اپنے بڑوں، معاصرین اور چھوٹوں سے استفادہ نہ کرے (مقدمہ فتح ص ۴۸۰) اسی لیے امام موصوف نے اپنے معاصرین و تلامذہ سے بھی روایت کی ہے (تہذیب التہذیب ص ۵۰ ج ۹)

تلامذہ | امام صاحب کے تلامذہ اور مستفیدین کا حلقہ بھی نہایت وسیع تھا، فربری لکھتے ہیں کہ امام صاحب سے براہ راست نوے ہزار آدمیوں نے جامع صحیح کو سنا تھا، (ارشاد الساری)

امام صاحب کا حلقۂ درس نہایت وسیع تھا، دنیائے اسلام کے مختلف گوشوں کے آدمی اس میں شریک ہوتے تھے، ان کی مجلس درس کبھی مسجد میں اور کبھی ان کے مکان میں منعقد ہوتی تھی، ان کے شاگردوں میں بڑے پایہ کے علما، ومحدثین تھے، مثلاً حافظ ابو عیسیٰ ترمذی، ابو عبد الرحمٰن نسائی، مسلم بن حجاج وغیرہ، جو حدیث کے ارکان ستہ کے جلیل القدر رکن ہیں (تہذیب الاسماء و اللغات نووی ص ۷۰) ابو زرعہ، ابو حاتم، ابن خزیمہ، محمد بن نصر مروزی، ابو عبد اللہ الفربری، وغیرہم بھی امام صاحب کے تلامذہ میں ہیں، جو آگے چل کر خود بڑے پایہ کے محدث ہوئے، اور ان سے ہزاروں لاکھوں کو نفع پہنچا (تذکرۃ الحفاظ)

غیر معمولی قوت حافظہ | امام موصوف نہایت قوی الحافظہ تھے، استاد سے جو حدیث بھی سنتے فوراً زبانی یاد ہو جاتی، کہا جاتا ہے کہ بچپن ہی میں ان کو ستر ہزار حدیثیں یاد تھیں، جس کتاب پر ایک نظر ڈال لیتے تھے، وہ حافظہ میں محفوظ ہو جاتی تھی،

ابن مجاہد بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں محمد بن سلام بیکندی کے پاس تھا، انھوں نے

فرمایا کہ اگر تم کچھ دیر پہلے آگئے ہوتے تو میں تمھیں ایک ایسا بچہ دکھاتا جس کو ستر ہزار حدیثیں زبانی یاد ہیں، (مقدمہ فتح ص ۴۸۴)

امام صاحب خود فرماتے تھے کہ "مجھے ایک لاکھ صحیح اور دو لاکھ غیر صحیح حدیثیں یاد ہیں، اور اس جامع صحیح کو میں نے چھ لاکھ احادیث سے منتخب کیا ہے"۔ (مقدمہ ارشاد الساری ص ۲۹۰)

امام صاحب کی زندگی کا مشہور واقعہ ہے کہ آپ جس وقت بغداد تشریف لائے تو وہاں کے محدثین نے آپ کا امتحان لینا چاہا چنانچہ سو احادیث کے متن اور سندوں میں الٹ پھیر کرکے دس آدمیوں کے حوالہ کیا کہ ہر شخص ان میں سے دس دس حدیثیں اسی طرح امام صاحب کے سامنے پیش کرے، شہر کے بہت سے لوگ اس کو دیکھنے کے لیے جمع ہوئے، پھر ان محدثین نے حدیثیں پیش کیں، ہر مرتبہ امام موصوف "لا أدری" ہی فرماتے رہے، جب سب لوگ حدیثیں پیش کر چکے تو امام صاحب نے ہر متن کو اس کی اصلی سند اور ہر سند کو اس کے اصلی متن کے ساتھ ملحق کرکے ترتیب وار سنا دیا، لوگ سن کر دنگ رہ گئے، اور آپ کے علم وفضل کا ان کو لوہا ماننا پڑا، فأقر الناس له بالحفظ وأذعنوا له بالفضل"۔

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ تعجب اس پر نہیں ہے کہ صحیح و غلط میں امتیاز کر دیا، کمال یہ ہے کہ ان لوگوں نے جس ترتیب سے روایات کو غلط شکل میں پیش کیا تھا، اس کو بھی بیان کر دیا۔

(مقدمہ فتح الباری ص ۵۰۳، فتح المغیث ص ۱۱۶)

انسائیکلوپیڈیا کے مصنفین نے بھی امام بخاری کے کمال حفظ کے متعلق لکھا ہے: "امام بخاری کا حافظہ و استحضار اس غضب کا تھا کہ معاصرین ائمہ تک کو وہ ایک کرامت نظر آتا تھا"۔ (جلد چہارم ص ۵۰۰)

امام بخاری کا زہد و تقویٰ | علامہ کرمانی کہتے ہیں کہ امام صاحب کو اللہ تعالیٰ نے دنیا کی دولت بھی

عطا فرمائی تھی، انھوں نے اپنے والد سے ترکہ میں بہت سا مال پایا تھا، اس کو اللہ کے راستہ میں خرچ کرتے رہتے تھے، اور بسا اوقات آپ کو دو یا تین بادام پر دن گذارنا پڑا، شاہ ولی اللہ صاحب فرماتے ہیں:۔

کان قلیل الأکل جداً مفرداً فی الجود وقال کان یقنع کل یوم بلوزتین وثلاث

(فیما یجب حفظه للناظر ص)

امام صاحب نے کسی امیر یا بادشاہ کی فیاضی سے کبھی فائدہ نہیں اٹھایا، حالانکہ بارہا اس کے مواقع آئے، ان کے شاگرد امام موصوف کے واسطہ سے بیان کرتے ہیں کہ جس وقت میں آدم ابن ایاس کی خدمت میں حاضر ہوا، تو خرچ کے آنے میں بڑی تاخیر ہوئی، یہاں تک کہ مجھکو گھاس کھا کر دو دن گذارنے پڑے، تیسرے دن ایک صاحب نے آکر مجھے دینار کی تھیلی پیش کی، جن کو میں پہچانتا بھی نہ تھا، اسی طرح ان کے ایک اور شاگرد کا امام صاحب کے واسطہ سے بیان ہے، کہ جس وقت سے مجھے غیبت کی حرمت معلوم ہوئی، اس وقت سے میں نے کسی کی غیبت نہیں کی، اور اللہ تعالیٰ سے مجھے امید ہے کہ وہ اس بارے میں میرا محاسبہ نہیں فرمائے گا۔

امام موصوف ایک مرتبہ بیمار ہوئے، ان کا قارورہ اطبا کو دکھایا گیا، انھوں نے کہا معلوم ہوتا ہے کہ یہ سالن استعمال نہیں کرتے۔ امام موصوف نے فرمایا کہ چالیس سال سے سالن استعمال کرنے کا اتفاق نہیں ہوا، نماز میں امام صاحب کے استغراق کا یہ واقعہ حافظ ابن حجر نے نقل کیا ہے، کہ ایک بار ظہر کی نماز سے فراغت کے بعد نفل میں مشغول ہو گئے، اس سے فارغ ہونے کے بعد اپنی قمیص کا دامن اٹھا کر اپنے بعض ساتھیوں سے فرمایا کہ دیکھو قمیص کے اندر کچھ ہے تو نہیں، انھوں نے دیکھا تو بھڑ نکلی جس کے ڈنک سے سترہ نشانات تھے، اور جسم کا وہ حصہ متورم ہو گیا تھا، ایک صاحب نے عرض کیا کہ آپ نے نماز کیوں نہیں توڑ دی، فرمایا میں ایک ایسی سورہ پڑھ رہا تھا کہ دل چاہتا تھا کہ اس کو ختم کر لوں۔ (مقدمہ قسطلانی ص ۳۱، لامع ص ۸)

شیوخ و معاصرین کا اعتراف

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ امام صاحب کی مدح میں اگر متاخرین کے اقوال نقل کیے جائیں تو کاغذ اور روشنائی ختم ہوجائے، "فذالك بحر لا ساحل له"

ع سفینہ چاہیے اس بحر بیکراں کے لیے

ان کے شیوخ و معاصرین سب ان کے کمالات کے معترف تھے۔ ایک مرتبہ عمرو بن زرارہ اور محمد بن رافع امام بخاری سے علل حدیث کے متعلق مختلف سوالات کے جواب حاصل کرنے کے بعد جب رخصت ہونے لگے، تو حاضرین مجلس سے مخاطب ہوکر کہا کہ "ابو عبد الله افقه منا واعلم وابصر" امام اسحاق بن راہویہ نے فرمایا "هو ابصر مني" حالانکہ اس وقت امام صاحب سبزہ آغاز تھے۔

امام ترمذی فرماتے ہیں کہ اسانید و علل میں امام بخاری سے بڑھ کر میں نے کسی کو نہیں پایا، امام مسلم نے امام بخاری کی خدمت میں حاضر ہوکر یہ شہادت دی "اشهد انه ليس في الدنيا مثلك" (مقدمہ فتح ص ۴۸۵) ابن خزیمہ فرماتے ہیں کہ اس آسمان کے نیچے امام بخاری سے بڑھکر میں نے کسی کو عالم حدیث نہیں دیکھا۔ (تہذیب الاسماء واللغات نووی ج ۱ ص ۷۰)

امام صاحب پر دور ابتلاء و آزمائش

حدیث میں ہے کہ "اشد الناس بلاء الانبياء الامثل فالامثل" چنانچہ امام موصوف کو بھی اللہ تبارک و تعالیٰ نے بڑے بڑے امتحان میں ڈالا، امام موصوف ۲۵۰ھ میں جب نیشاپور تشریف لائے تو محمد بن یحییٰ ذہلی نے لوگوں سے کہا کہ ان صالح عالم کی خدمت میں جاکر ان سے حدیثیں سنو، ان کے کہنے پر لوگ اس کثرت سے امام موصوف کی خدمت میں حاضر ہوئے کہ خود محمد بن یحییٰ کی مجلس درس ماند پڑگئی، پھر امام صاحب جس شان سے نیشاپور میں داخل ہوئے اس کی تصویر امام مسلم نے ان لفظوں میں کھینچی ہے کہ اہل نیشاپور نے اس سے پہلے کسی والی اور کسی عالم کا ایسا استقبال نہیں کیا تھا، ان کے استقبال کے لیے نیشاپور سے دو تین منزل باہر نکل آئے تھے، امام صاحب نیشاپور پہنچکر

درس و تدریس میں مشغول ہوگئے، امام ذہلی نے اعلان کردیا تھا کہ کسی اختلافی مسئلہ میں امام صاحب سے گفتگو کیجائے، ورنہ اگر کوئی جواب ہمارے خلاف ہوا تو خراسان کے لوگ ہمارا مذاق اڑائیں گے، لیکن امام صاحب کے آنے کے دو ہی چار دن کے بعد جب آپ کے اشتیاق میں مکانوں اور چھتوں پر لوگوں کا ہجوم تھا، ایک شخص نے قرآن کے الفاظ کے متعلق بار بار سوال کیا، اس لیے مجبوراً امام صاحب کو اس کا جواب دینا پڑا، آپ نے فرمایا:

القرآن كلام الله غير مخلوق	قرآن کلام الٰہی غیر مخلوق ہے، الفاظ ہمارے
الفاظنا من افعالنا وافعالنا	زبان کا فعل ہیں، اور ہمارے تمام افعال
مخلوقة والامتحان عنه بدعة	مخلوق ہیں، اور اس مسئلہ میں امتحان الینا بدعت ہے

عوام اس دقیق جواب کو نہ سمجھ سکے اور امام ذہلی نے شدت سے امام صاحب کی مخالفت شروع کردی، اور اپنی مجلس میں اعلان کرادیا کہ جو شخص لفظی بالقرآن غیر مخلوق کا قائل ہو وہ ہماری مجلس درس میں نہ آئے، اس پر امام مسلم، احمد بن سلمہ جو حلقۂ درس کے ممتاز طالب علم تھے، امام ذہلی کی ساری تقریروں کو واپس کردیا اور ان کا حلقہ چھوڑدیا، (مقدمہ فتح ص ۴۹۲)

مسئلۂ خلق قرآن میں امام صاحب کا نقطۂ نظر

خلق قرآن کے بارہ میں اوپر امام بخاری کا جو قول نقل کیا گیا ہے، اس سے یہ شبہہ ہوسکتا ہے کہ وہ اس مسئلہ میں امام احمد کے خلاف ہیں، حالانکہ اگر غور کیا جائے تو فی الواقع دونوں میں کوئی اختلاف نہیں ہے، واقعہ یہ ہے کہ معتزلہ نے جب یہ مسئلہ اختیار کیا کہ جس طرح خدا نے دنیا کو کُن فیکون کے ذریعہ پیدا کیا ہے، اسی طرح قرآن کو بھی پیدا کیا ہے اس سے معلوم ہوا کہ قرآن مخلوق ہے لیکن یہ عقیدہ جمہور اہل سنت کے خلاف ہے۔

امام بیہقی فرماتے ہیں کہ اہل سنت والجماعت کے نزدیک اس مسئلہ میں اتفاق ہے کہ قرآن کلام الٰہی ہے، اور باری تعالیٰ کی صفت ہے، کیونکہ متلو اور تلاوت کے درمیان فرق نہ

متلو تو قدیم ہے اور تلاوت ہمارا فعل ہے اس لیے وہ حادث ہے، (کتاب الاسماء والصفات بیہقی ص ۱۹۸)

بعض لوگ اس تفریق کو پسند نہیں کرتے تھے، لیکن امام بخاری متلو اور تلاوت کے درمیان تفریق کرتے تھے، اور امام ذہلی کو اس پر اعتراض تھا (کتاب الاسماء والصفات بیہقی ج ا ص ۱۹۹)

امام احمد نے ان لوگوں پر جنھوں نے کلام اللہ کو مخلوق یا غیر مخلوق کہا یا اس بارہ میں توقف اختیار کیا ہے، اسلیے سخت تنقید کی ہے، اور پوری قوت سے ان کا رد کیا، تاکہ آیندہ کے لیے اس مسئلہ پر گفتگو کا دروازہ بند ہو جائے، لیکن بعد میں حنابلہ نے یہاں تک غلو کیا کہ کلام مجید کے روشنائی اور اوراق سب قدیم ہیں، بعض نے قلم تک کو جس سے قرآن مجید لکھا گیا ہے، قدیم کہہ دیا، امام بخاری کو اس غلو سے اختلاف تھا اور ہونا بھی چاہیے تھا، جیسا کہ بخاری جلد ثانی باب خلق افعال العباد میں اس کی طرف اشارہ موجود ہے، اس بنا پر امام بخاری اور حنابلہ میں کشمکش پیدا ہو گئی، اور امام صاحب کو قید و بند کی تکلیفیں بھی برداشت کرنا پڑیں، کیونکہ حکومت پر حنابلہ کا اثر تھا، غرض نیشاپور میں لوگوں نے محض فتنہ انگیزی کے لیے اس قسم کے سوال وجواب پر امام صاحب کو مجبور کیا، جس کے نتیجہ میں ان کو نیشاپور چھوڑ کر اپنے وطن مالوف بخارا واپس آنا پڑا، لیکن وہاں بھی مخالفین نے سکون سے رہنے نہ دیا، (لامع الدراری ص ۳۴ وافادات حضرۃ الاستاذ مدظلہ)

وفات چنانچہ امام صاحب کے بخارا واپس آنے کے بعد لوگوں نے والی بخارا کو آپ کے خلاف بھڑکانے کے لیے مختلف مقامات سے اس کے پاس خطوط لکھے، امام ذہلی نے بھی اس میں حصہ لیا، ان خطوط پر والی بخارا امام صاحب سے ناراض ہو گیا، (لامع ص ۱۲) کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ والی بخارا کی خواہش تھی کہ امام صاحب اس کے گھر پر جاکر اس کے بچوں کو الجامع الصحیح اور التاریخ الکبیر پڑھا دیں، امام صاحب نے اس بنا پر اس سے انکار کیا کہ اس میں علم کی توہین تھی،

تو والی بخارا نے کہا کہ لڑکے خود امام صاحب کی خدمت میں حاضر ہو جایا کریں گے، لیکن اس وقت وہاں کوئی دوسرا طالب علم نہ ہو، اس کو بھی امام صاحب نے منظور نہیں کیا، اس پر والی بخارا آپ سے برہم ہو گیا، اور آپ کو بخارا سے نکل جانے کا حکم دیا، جب سمرقند والوں کو معلوم ہوا تو انھوں نے اپنے یہاں آنے کی دعوت دی، لیکن وہاں کے لوگوں میں بھی اختلاف پیدا ہو گیا، مجبوراً اپنے ننہال خرتنگ چلے گئے، جو بخارا سے تھوڑے فاصلے پر تھا، پھر رمضان المبارک کا مہینہ گذار کر شوال میں سمرقند جا رہے تھے کہ راستہ میں دفعۃً پیام اجل آگیا، اور ۲۵۶ھ میں باسٹھ سال کی عمر میں حدیث رسول کا یہ آفتاب تاباں غروب ہو گیا، (مقدمہ فتح الباری ص ۴۹۴)

امام بخاری کا مسلک امام صاحب کے مسلک کے بارہ میں علماء میں اختلاف ہے، کیا، محدثین کے ساتھ ہمیشہ سے یہ معاملہ رہا ہے کہ مختلف مسلک والوں نے انکو اپنے اپنے مسلک کا پیرو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، یہی معاملہ امام بخاری کے ساتھ بھی ہوا، تقی الدین السبکی نے طبقات الشافعیہ میں اور نواب صدیق حسن خاں صاحب نے ابجد العلوم میں شافعی ان کو لکھا ہے، (ابجد ص ۸۱۰) حافظ ابن حجر کے نزدیک امام بخاری کے مباحث فقہیہ کا غالب حصہ امام شافعی کے مسلک سے ماخوذ ہے (فتح ج اول ص ۲۱۳) علامہ ابن قیم کی تحقیق میں امام موصوف حنبلی تھے، (اعلام الموقعین ج ا ص ۲۲۶) لیکن علامہ طاہر جزائری کی نظر میں مجتہد مطلق ہیں، (توجیہ النظر ص ۱۸۵) مگر ان کی جامع صحیح کے مطالعہ سے جیسا کہ علامہ انور شاہ فرماتے ہیں، واضح ہوتا ہے کہ آپ بلا شک وشبہ مجتہد مطلق تھے، اور یہ شہرت کہ آپ شافعی تھے اور آپ نے مسائل مشہورہ میں امام شافعی

کے مسلک کی پیروی کی ہے، صحیح نہیں ہے۔ امام ابو حنیفہؒ کی موافقت بھی امام شافعی سے کم نہیں ہے۔ (فیض الباری ج ا ص ۵۸) حضرۃ الاستاذ شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب فرماتے ہیں کہ حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے شافعیہ کے مسائل پر جتنی جگہوں پر رد کیا ہے، اس کی تعداد حنفیہ کے رد سے کم نہیں ہے، البتہ حنفیہ کی زیادہ قوت سے تردید کی ہے، اور اس کے وجوہ ہیں۔ (لامع ص ۱۵) اس پر یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ اگر امام موصوف مجتہد مطلق ہیں تو ان کے خاص شاگرد امام ترمذی نے جہاں اپنی کتاب میں مذاہب کی طویل فہرست نقل فرمائی ہے، اس میں امام موصوف کا مسلک پوری کتاب میں ایک جگہ باب الاقتداء بالامام میں نقل کیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ امام بخاری مجتہد مطلق نہیں تھے، اس کا جواب یہ ہے کہ چونکہ ان کا مذہب رائج نہیں ہوا تھا، اور نہ ان کے مقلد ہوئے، اس لیے ان کے مذہب کو بیان نہیں فرمایا۔ (افادات)

باقی

جمع و تدوین قرآن

از

جناب سید صدیق حسن صاحب مرحوم

(۴)

علامہ بحر العلوم عبد العلی ابو العیاش لکھتے ہیں:۔ "جن روایتوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان صحابہ کی ترتیب اس قرآن کے خلاف تھی، وہ تمام وہمی اور خیالی ہیں، کسی معتبر کتاب میں ایسی روایت نہیں"[۵]

حافظ اسلم جیراجپوری لکھتے ہیں:۔ "جو روایت ترتیب مصاحف ابیؓ بن کعب و عبد اللہ ابن مسعودؓ میں ہو وہ کسی طرح قابل اعتماد نہیں، کیونکہ یہ روایت حدیث کے طبقۂ چہارم سے بھی ادنیٰ درجہ کی کتابوں میں ہے، کسی مستند حدیث کی کتاب میں نہیں"[۶]

ابن حزم لکھتے ہیں:۔ "معوذتین کے متعلق وہ روایتیں جن سے ابن مسعودؓ کا انکار ثابت ہوتا ہے، محض افترا اور جعل ہیں، کیونکہ ابن مسعودؓ سے عاصم کی روایت میں جو نہایت صحیح ہے، معوذتین ہیں، اور یہ بات کہ ابن مسعودؓ کا قرآن ہمارے موجودہ قرآن سے مختلف ہے، محض بہتان، افترا اور جھوٹ ہے، اور یہی رائے تمام ائمۂ دین کی ہے، جس میں قاضی ابوبکر، امام فخر الدین رازی اور محی الدین نووی وغیرہ سب شامل ہیں"۔

---

[۵] رحمانی ص ۷۱ [۶] تاریخ القرآن ص ۳۷، ۳۸

ایک روایت اس سلسلہ میں حسب ذیل ہے:-

قال قلت لعثمان ما حملکم	میں نے حضرت عثمانؓ سے عرض کیا کہ آپکو
علی ان عمدتم الی الانفال	کس بات نے اس چیز پر آمادہ کیا کہ انفال
وھو من المثانی وبرأۃ وھی	جو کہ مثانی میں سے ہے اور برأۃ جو مئین
من المئین فقرنتم بینھما	میں سے ہے، ان دونوں کے درمیان ختم
ولن تکتبوا بینھما سطر بسم اللّٰہ	ہو جاتا ہے، آپ نے فصل کے طور پر
الرحمان الرحیم ووضعتموھا فی	بسم اللہ کیوں نہیں لکھی، اور اسے
سبع طوال	آپ نے سبع طوال میں رکھدیا؟
فقال عثمان. کان رسول اللّٰہ صلعم	حضرت عثمانؓ نے جواب میں فرمایا کہ جب
ینزل علیہ السور ذوات	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر متعدد
العدد فکان اذا انزل علیہ	سورتیں نازل ہوتیں تو آپ کاتبان وحی
الشئ دعا بعضھم کان یکتب	میں سے کسی کو طلب فرما کر حکم دیتے تھے کہ
فیقول ضعوا ھولاء الآیات	ان آیتوں کو اس سورہ میں رکھو جیسا کہ
فی السورۃ التی یذکر فیھا	آپ تذکرہ فرماتے) انفال ان سورتوں
کذا وکذا۔ وکانت الانفال	میں ہے جو مدینہ کے اوائل میں نازل
من اوائل ما نزل بالمدینۃ	ہوئی. نزول کے اعتبار سے قرآن مجید
وکانت البرأۃ من اٰخر القرآن	کی آخری سورہ برأۃ تھی، چنانچہ اس کا
نزولا وکانت قصتھا شبیھۃ	شان نزول بھی انفال کے مشابہ ہے،
بقصتھا فظننت انھا منھا فقبض	اس بنا پر میں نے یہ خیال کیا کہ برأۃ بھی

رسول اللّٰہ صلعم ولم یبین لنا انھا	انفال ہی کا جزو ہے، اور اس درمیان میں
فمن اجل ذٰلک قرنت بینھما	نبی کریمؐ کی وفات ہو گئی، اور یہ مسئلہ آپ نے
ولم اکتب بینھما سطر بسم اللّٰہ	واضح نہیں فرمایا کہ وہ سورہ اسی کا جزو ہے
ووضعتھا فی السبع الطوال	چنانچہ اس وجہ سے میں نے اس کو آپس میں ملا دیا
	اور اس کے درمیان بسم اللہ نہیں لکھی اور
	اور اسے سبع طوال میں رکھا،

اس حدیث کو امام احمد، ابو داؤد، ترمذی، نسائی، ابن حبان، حاکم نے روایت کی ہے۔
اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ سورتوں کی ترتیب صحابہ کی رائے سے ہوئی،
ترمذی نے اس حدیث کو نقل کر کے لکھا ہے کہ یہ حدیث حسن ہے اور صرف عوف نے یزید سے روایت کی ہے، عوف اگرچہ محدثین کے نزدیک معتبر ہیں، مگر تہذیب التہذیب میں انہیں دو وجہوں سے ناقابل اعتبار ٹھہرایا ہے، اس کے علاوہ یزید فارسی مجہول شخص ہے اور امام مسلم اور بخاری نے اس سے روایت نہیں کی ہے، سب سے بڑی بات یہ ہے کہ یہ حدیث ان متواتر حدیثوں کے خلاف ہے جن میں برأۃ کو مستقل سورہ شمار کیا گیا ہے۔ اس روایت میں درایتاً بھی یہ بات قابل توجہ ہے کہ حضرت عثمانؓ سے یہ سوال کیا گیا کہ آپ نے انفال کو برأۃ کے ساتھ ملا کر کیوں لکھا اور بیچ میں بسم اللہ کیوں نہیں لکھی، اور یہ سوال وجواب ۲۵ھ کے بعد ہوا، جب حضرت عثمانؓ کے حکم سے قرآن کے مستند نسخے شائع ہو چکے تھے، اس لیے غور طلب یہ ہے کہ ۱۲ھ اور ۲۵ھ یعنی تیرہ چودہ برس کے عرصہ میں جب حضرت زیدؓ قرآن کا مستند نسخہ لکھکر خلیفۂ وقت کو دے چکے تھے، تو اس لمبے عرصہ میں کیا لوگوں نے مختلف الترتیب نسخے جمع کیے تھے، اور وہ تمام نسخے اس نئے نسخہ کے سامنے

کالعدم قرار دیے گئے، اور ایسے نیست و نابود کیے گئے کہ ان کا کہیں نام و نشان بھی نہیں ملتا،
اور یہ حضرت ابن مسعودؓ جیسے جلیل القدر صحابی کی زندگی اور ان کے علم میں ہوا، مگر ان کے کان
پر جوں تک نہیں رینگی،

ایک طرف تو صحابۂ کرام کی یہ ذہنیت تھی کہ جب حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ نے زید سے کہا
کہ "قرآن کو بین الدفتین جمع کردو" تو زید نے جواب دیا کہ آپ مجھے ایسا کام کرنے کے لیے
کیسے کہہ سکتے ہیں، جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا تھا، دوسری طرف یہ ذہنیت
ہے کہ جب یہ آمرانہ حکم خلیفہ کی طرف سے صادر ہوتا ہے کہ جو میرا مصحف اور میری بیاض ہے
بس وہی اصل اور درست مصحف ہے، اس کے خلاف جو بھی صحیفہ ہو اسے ضائع کردیا جائے
تو کسی اللہ کے بندے کو یہ توفیق نہیں ہوتی کہ وہ یہ کہہ سکے کہ تم اس کام کا کیسے حکم دے سکتے
ہو جو رسول خدا نے نہیں کیا تھا،

پھر ذرا اس ستم ظریفی کو ملاحظہ فرمائیے، کہ وصال نبوی کے چودہ پندرہ سال بعد
جب "بیاض عثمانی" مرتب کی جاتی ہے تو ہر سادہ لوح خلیفہ انفال اور برأت کو
ایک ساتھ ملا دیتا ہے، کہ ان دونوں کا مضمون مشابہ ہے، اسی لیے دونوں کے درمیان
بسم اللہ نہیں لکھا، مگر ان کو دو مستقل سورتوں کی حیثیت سے قائم رہنے دیتا ہے،
اس "اجتہاد" سے پہلے اسے خیال بھی نہیں ہوتا کہ زیدؓ کا مصحف یا ابن مسعودؓ کا مصحف منگا کے
دیکھ لے، کہ ان میں ترتیب کیا ہے، اور یہ دونوں علیحدہ علیحدہ سورتیں ہیں یا نہیں۔

اس سے پہلے زیادہ مزیدار روایت وہ ہے جو حضرت انسؓ کی جانب منسوب ہے، اس میں
کہا جاتا ہے کہ حضرت حذیفہؓ جب آذربیجان کے معرکہ سے واپس آئے تو انھوں نے خلیفۂ وقت
حضرت عثمانؓ کو شام اور عراق والوں کے "اختلافھم فی القرآن" کی طرف توجہ دلائی اور کہا

یا امیر المومنین ادرک ھذہ الامۃ	اے امیر المومنین اس وقت کا معاملہ سنبھالیے
قبل ان یختلفوا فی الکتاب کما	قبل اس کے کہ کتاب اللہ کے بارہ میں ان میں
اختلف الیھود والنصاریٰ	اسی قسم کا اختلاف شروع ہو جائے جس طرح
	سے یہود و نصاریٰ نے اختلاف کیا،

تو حضرت عثمانؓ نے ام المومنین حضرت حفصہؓ کے یہاں سے حضرت زیدؓ کا مرتب کیا ہوا نسخہ منگایا
اور زید بن ثابت، سعید بن العاص، عبدالرحمٰن الحارث بن ہشام اور عبداللہ بن زبیرؓ کو متعین کیا کہ
انسخوا الصحف فی المصاحف وقال لا ھط القرشیین الثلاثۃ اختلفتم
انتم و زید بن ثابت فاکتبوا بلسان قریش فانھا نزل بلسانھم
یعنی حضرت زیدؓ کا لکھا ہوا جو مستند نسخہ ام المومنین کے پاس تھا، اس کو منگا کے ان حضرات
کو دیا گیا کہ اس کی نقلیں تیار کردو اور یہ ہدایت کی گئی کہ اگر تم لوگوں کو زید کے نسخہ کی کسی چیز سے
اختلاف ہو تو اس کو قریش کی زبان کے مطابق لکھو، کیونکہ قرآن انکی زبان میں نازل ہوا،
غور فرمائیے، یہاں صرف سوال کتابت کا ہے، مثلاً "زید نے" "ملک یوم الدین" لکھا،
اختلاف اگر نقل کرنے والے کو ہو سکتا ہے تو صرف رسم الخط سے ہو سکتا ہے، یعنی اسے "مالک
یوم الدین" لکھنا چاہیے، یہ تو نہیں ہو سکتا کہ بجائے "مالک" کے کوئی دوسرا لفظ قریش کی
زبان کا یہاں رکھدیا جائے، یہ تو ممکن نہیں تھا، کہ ام المومنین کے نسخہ میں ایک لفظ ہو اور
لکھنے والے اس کے بجائے دوسرا لفظ لکھدیں، تحریف قرآن کا چارج تو آج تک کسی پڑھے
لکھے نے نہیں لگایا،

اس روایت میں حیرت انگیز ٹکڑا حسب ذیل ہے

قال الزھری حدثنی خارجۃ	زہری نے کہا کہ مجھ سے خارجہ بن زید نے

عن زید ان زید بن ثابت فقد
آیة من سورة الاحزاب کنت
اسمع رسول اللہ یقرءها "من
المومنین رجال صدقوا ما
عاھدوا اللہ علیه فمنھم
من قضی نحبه ومنھم من ینتظر"
فالتمستھا فوجدتھا مع خزیمة
بن ثابت وابی خزیمة فالحقتھا
فی سورتھا۔

بیان کیا کہ زید بن ثابت سے سورہ احزاب
کی ایک آیت گم ہوگئی، میں نے اسے نبی کریم
صلی اللہ علیہ وسلم کو پڑھتے ہوئے سنا تھا، وہ
آیۃ من المومنین الخ تھی، چنانچہ میں نے
اس کی جستجو کی تو اسے خزیمہ بن ثابت
اور ابوخزیمہ کے پاس پایا، اور اس کو
احزاب میں ملحق کردیا۔

کوئی تیرہ چودہ برس بعد جب قرآن کا تیسرا اڈیشن شائع ہونے لگا اور حضرت زیدؓ کو ان کا لکھا ہوا کلام مجید جو اس وقت تک خلیفہ اول و دوم اور پھر ام المومنین حضرت حفصہؓ کے پاس جزدان میں رکھا تھا، قرآن کے دوسرے نسخے تیار کرنے کے لیے جب نکالا گیا، اس وقت زیدؓ اپنے رفقائے کار یا اور جلیل القدر صحابی سے نہیں بلکہ اپنے بیٹے سے اس راز سربستہ کا انکشاف کیا کہ اس نسخہ میں ایک آیت سورہ احزاب کی نہیں ہے، اور اس آیت کو ڈھونڈھنے لگے، حالانکہ اس وقت ہزاروں نسخے کلام مجید کے دیار عرب میں مستعمل تھے، مگر کسی میں یہ آیت نہ ملی، اور بڑی تلاش و جستجو کے بعد خزیمہ بن ثابت انصاری کے پاس ملی۔ خزیمہ ایسے ممتاز جامع قرآن تھے جنھوں نے قرآن کے دوسرے اڈیشن کی ترتیب کے وقت سورہ برأت کی ایک گم شدہ "لقد جاء کم رسول الخ" بھی زید کو فراہم کی تھی، لیکن جب زید نے خود دوسرا اڈیشن مرتب کیا تھا تب بھی ان کو یاد نہ آیا کہ سورہ احزاب کی بھی ایک آیت کھوئی ہوئی ہے، اور ۱۳ برس بعد جب اپنا مرتب کیا ہوا قرآن دیکھا اسوقت انکے حافظے نے کام دیا اور وہ آیت دفعۃً یاد آگئی

یعنی جو آیت ایک سال بعد یاد نہ آئی تھی وہ تیرہ سال بعد یاد آگئی، اسی لیے علما نے ایسی روایتوں پر تنقید کی ہے، چنانچہ زہری کی زید بن ثابت والی روایت جو پہلے پیش کیجا چکی ہے، اس کی سند کے بارہ میں مولانا رحمانی لکھتے ہیں کہ "یہ خبر احاد میں سے ہے، اور زہری اگرچہ محدثین کے نزدیک نہایت معتبر، قابل وثوق، واستاذ اور امین ہیں اور تمام کتب صحاح میں ان کی روایتیں ہیں لیکن اسی کے ساتھ وہ مدرج تھے، یعنی اپنے کلام کو حدیث میں اس طرح ملا کر بیان کردیتے تھے کہ سننے والے کو یہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ بھی حدیث ہی ہے،

چنانچہ المختصر میں ہے:-

فانه کان یخلط کلامه بالحدیث
ولذلک قال له موسی بن
عقبة افصل کلام رسول اللہ
من کلامک

امام زہری اپنے کلام کو حدیث میں خلط ملط
کردیا کرتے تھے، اسی بنا پر موسیٰ بن عقبہ نے
ان سے کہا کہ اپنے کلام کو رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم کے کلام سے الگ کرلیا کرو۔

آگے چل مولانا رحمانی لکھتے ہیں کہ اس روایت اور امام بخاری نے کتاب الاحکام میں ابن شہاب زہری سے ابراہیم بن سعد کی جو روایت نقل کی ہے، ان دونوں میں حسب ذیل اختلافات ہیں۔ اختلافات خط کشیدہ ہیں:

زہری سے شعیب کی روایت کے الفاظ یہ ہیں:-

(۱) قد استحر یوم الیمامة بالناس

(۲) من الرقاع والاکتاف والعسب

(۳) حتی وجدت من سورة التوبة آیتین

(۴) مع خزیمة الانصاری

(۵) لم اجدها مع احد غیرہ

زہری سے ابراہیم کی روایت کے الفاظ یہ ہیں :-

قد استحر یوم الیمامہ لقراء القرآن ۔

من العسیب والرقاع واللخاف

فوجدت آخر سورۃ توبۃ

مع خزیمۃ اور ابی خزیمۃ

یہ الفاظ نہیں ہیں

فالحقتہا فی سورتہا ۔

ان اختلافات کے باوجود اگر یہ حدیث صحیح مان بھی لیجائے تو جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا ہے، اُس میں جمع قرآن سے کتابت قرآن نہیں بلکہ ایک مستند قرآنی نسخہ تیار کرنا مقصود

کتاب اللہ پر لکھنے والوں کی کمی نہیں، بے شمار لوگوں نے اپنی پوری کی پوری زندگی اس سعادت کو حاصل کرنے میں صرف کر دی ہے، اس کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جس پر سیر حاصل بحث نہ ہو چکی ہو، اور اب کوئی نئی بات کہنا ناممکن ہے، پھر بھی اس سلسلۃ الذہب میں شامل ہونا تابع محمل کی حیثیت سے ہی سہی، باعث صد افتخار ہے، یہی جذبہ اس مقالہ کا محرک ہوا۔

ع بلبل ہمیں کہ قافیہ گل شود بس است

ادبیات

غزل

از

جناب محسن رضا جونپوری

ترکِ معیتِ دلِ رسوا کبھی کبھی | یوں بھی تلاشِ منزلِ لیلیٰ کبھی کبھی

اللہ رے جاں نوازیٔ غمہائے معتبر | رشکِ ارم بنی یہی دنیا کبھی کبھی

سمجھا تھا جس کو شعلۂ لرزاں سرِ مژہ | طوفاں بدوش تھا وہی قطرا کبھی کبھی

کرتا ہیں ان کے سامنے افشائے رازِ دل | آئی ہے لب پہ یہ بھی تمنا کبھی کبھی

لطف و کرم کہاں کا کہاں کی عنایتیں | ان کو ستم بھی تھا نہ گوارا کبھی کبھی

قلب و نظر کو ہو نہ سکی ہم نشیں خبر | یوں بھی ہوا ہے ان کا اشارا کبھی کبھی

غیروں کا ذکر کیا کہ سرِ جادۂ وفا | کام آ سکا نہ ان کا سہارا کبھی کبھی

دل شکوہ سنجِ طرزِ تغافل رہا مگر | راس آگیا ہے وعدۂ فردا کبھی کبھی

ہر چند دل تھا محوِ طوافِ حرم مگر | یاد آگئے ہیں دیر و کلیسا کبھی کبھی

آنکھوں کو دیکے دعوتِ محرومیٔ نظر | اٹھا حریمِ ناز کا پردا کبھی کبھی

اُس موجِ اضطراب کو کیا کہئے اے رضاؔ
دل کے سکوں نے جس کو پکارا کبھی کبھی

غزل

از

جناب مولانا زین الدین احمد صاحب نیّر اصلاحی

تیر جب کوئی خطا ہوتا ہوا پاتا ہوں میں — ناوکِ مژگاں کی زد پر خود چلا جاتا ہوں میں

تیری یادِ جانفزا سے دل کو بہلاتا ہوں میں — ہجر کی راتوں میں خلوت کے مزے پاتا ہوں میں

ذوقِ عصیاں پر جو اپنے یوں مٹا جاتا ہوں میں — چشمِ رحمت کی برابر شہ پہ شہ پاتا ہوں میں

لالہ و گل کیا، شفق کیا، یہ مہ و خورشید کیا — چھپنے والے تیرا جلوہ ہر جگہ پاتا ہوں میں

رقصِ بسمل میں مرے قاتل کے سب انداز ہیں — خود تڑپ کر اہلِ محفل کو بھی تڑپاتا ہوں میں

اس رخِ رنگیں پہ چھایا ہے مرا کیفِ نظر — اپنے ہی کیفِ نظر پر خود مٹا جاتا ہوں میں

کیف برسے گا ابھی اٹھے گی اک طرفہ گھٹا — جامِ مے کو گنبدِ مینا سے ٹکراتا ہوں میں

ان کا حسن جانفزا ہے یا مرا ذوقِ نظر — جلوہ گاہ حسن میں اک کشمکش پاتا ہوں میں

میں جو سمٹوں تو وہی اک ذرۂ ناچیز ہوں — اور پھیلوں تو محیطِ دہر بن جاتا ہوں میں

رقص کرتا ہوں "انا الحق" کہہ کے خود منصور دار — شاہدِ فطرت کو جب آغوش میں لاتا ہوں میں

دیدۂ حیراں سے نیّر بارگاہِ حسن میں

اک بہارِ ناز کو آئینہ دکھلاتا ہوں میں

مطبوعات جدیدہ

جہانیاں جہاں گشت ۔ از محمد ایوب صاحب قادری، صفحات ۲۴۰، کتابت وطباعت بہتر، ناشر ادارۂ تحقیق و تصنیف [illegible] وحید آباد کراچی ۵، قیمت مجلد عہ

حضرت مخدوم جلال الدین جہانیاں جہاں گشت آٹھویں صدی ہجری کے ان ممتاز بزرگوں میں ہیں جنھوں نے بتکدۂ ہند میں کلمۂ اسلام کی آواز بلند کی اور اپنے صوفیانہ طرز تبلیغ کے ذریعہ اسلام کی روشنی گھر گھر پھیلائی، مغربی پاکستان میں دعوت و تبلیغ کے دو اہم مرکز تھے، ایک اوچ دوسرے ملتان، مخدوم صاحب کا مولد و مدفن دونوں اوچ ہے، مگر ان کے فیض کی ہمہ گیری اور سیر و سیاحت کی کثرت کی وجہ سے وہ اوچی سے زیادہ جہانیاں جہاں گشت مشہور ہوئے۔

اردو میں مخدوم صاحب پر متعدد مضامین اور کتابیں شائع ہو چکی ہیں، لیکن یہ کتاب اپنے تحقیقی مواد اور شگفتہ علمی انداز تحریر کی وجہ سے ان سب میں ممتاز ہے، پہلے باب میں اسلام کے داخلہ اور علماء و صلحاء کی تبلیغی کوششوں پر جو کچھ لکھا ہے اس نے کتاب کی قیمت کو اور زیادہ بڑھا دیا ہے، گویا یہ کتاب ہندوستان کی تاریخ دعوت و تبلیغ کا ایک ہلکا سا تعارف ہے، کتاب میں کل آٹھ ابواب ہیں اور ہر باب بار بار مطالعہ کے لائق ہے، صوفیائے کرام کے سوانح و حالات سے ہند و پاک میں ادھر چند برسوں سے جو اعتنا پیدا ہوا ہے، وہ اسلام کی دعوت و تبلیغ کے لیے فال نیک ہے، اور یہ اس لحاظ سے بھی مفید ہے کہ ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی تاریخ

صوفیا کے سوانح حیات کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی، اور یہ کتاب اس کے لیے دلیل راہ ہے،

معارف النفس - از خواجہ عبد الرشید صاحب، صفحات ۱۸۸، کتابت وطباعت متوسط، ناشر مجلس اخوان الصفا کراچی، قیمت مع؍

معرفت نفس خدا کی معرفت کا زینہ ہے۔ "من عرف نفسہ عرف ربہ" صوفیا کا مشہور مقولہ ہے معرفت نفس پر علم نفسیات میں بھی بحث ہوتی ہے اور تصوف میں بھی، مگر تصوف کی عملی راہ نفسیات سے جدا ہے، نفسیات انسانی ذہن کی پیداوار ہے، اور تصوف کا رشتہ انسانی تجربات کے ساتھ شریعت خداوندی سے بھی جڑا ہوا ہے، اس لیے اس کے ذریعہ زندگی میں تبدیلی ہوتی ہے، خواجہ صاحب جدید نفسیات اور مغربی رجحانات کے ساتھ تصوف کے بھی لذت آشنا معلوم ہوتے ہیں، اس لیے جدید نفسیات کی روشنی میں تصوف اور اس کی تعلیمات کو بڑے فلسفیانہ اور اچھوتے انداز میں پیش کیا ہے، موجودہ دور کا ذہن تصوف کو ناقابل التفات چیز سمجھتا ہے، مگر خواجہ صاحب نے ایسے موثر اور علمی انداز میں اس کو پیش کیا ہے کہ وہ زندگی کی واقعی ایک اہم ترین ضرورت معلوم ہونے لگتا ہے، امید ہے کہ اس کتاب کے ذریعہ یہ غلط فہمی دور ہو جائے گی کہ تصوف عملی زندگی سے کوئی جدا چیز ہے،

آفتاب ہجویر - از پیام شاہجہاں پوری، صفحات ۱۵۲، کتابت وطباعت عمدہ، ناشر ملک سراج الدین اینڈ سنز، کشمیری بازار، لاہور۔

شیخ ابوالحسن علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ ہندوستان کے ان قدیم صوفیا میں ہیں جو پانچویں صدی ہجری کی ابتدا میں ہندوستان تشریف لائے اور اپنی تبلیغی کوششوں سے اس وقت اسلام کی روشنی پھیلائی، جب یہاں مسلمانوں کی حکومت مستحکم نہیں ہو سکی تھی، ان کی آمد سے پہلے مسلمانوں کی آبادیاں یا تو جنوبی ہند کے ساحلی علاقوں میں تھیں یا سندھ میں مگر قلب ہندوستان میں ابھی اسلام کی روشنی نہیں پھیلی تھی، حضرت شیخ ہجویریؒ دوسرے یا تیسرے بزرگ ہیں جنھوں نے لاہور کو

اپنی دعوت و تبلیغ کا مرکز بنایا، شیخ کی کتاب کشف المحجوب احسان و تصوف کی ان بنیادی کتابوں میں ہے جو ابتدائے تصنیف سے آج تک متداول اور مقبول خواص ہے،

آفتاب ہجویری میں شیخ کے حالات زندگی، ان کے علم و فضل اور ان کی تعلیمات پر بڑی مفصل روشنی ڈالی گئی ہے، امید ہے کہ یہ کتاب مقبول ہوگی، اور اس کے ذریعہ صرف بزرگوں کے حالات اور کارناموں سے واقفیت حاصل ہوگی بلکہ موجودہ دور میں اسلام کی دعوت و تبلیغ کے لیے اس سے راہنمائی بھی حاصل ہوگی،

قومی کتابیات (شعبۂ اردو) — از بی، ایس کیشون و سید جمیل احمد، صفحات ۹۸، ٹائپ، ناشر بھاشا وبھاگ، اترپردیش سرکار، لکھنؤ، قیمت تے؍

قومی کتابیات ان اردو مطبوعات کی فہرست ہے: جو ۱۹۶۱ء میں ہندوستان میں شائع ہوئیں، اور جن کی کاپیاں نیشنل لائبریری میں بھیجی گئیں، اس میں ہر فن کی کتابوں کی الگ الگ تفصیل دی گئی ہے، اس کی اشاعت سے ملک میں ہونے والے علمی و ادبی کاموں سے بڑی تفصیلی آگاہی ہو جاتی ہے، جو تصنیفی کام کرنے والوں اور لائبریریوں کے لیے بڑی مفید چیز ہے، اس کتاب کی اشاعت کے لیے مرتب اور اترپردیش سرکار دونوں مبارکباد کے مستحق ہیں۔

صوبۂ شمالی و مغربی کے اخبارات و مطبوعات — از محمد عتیق صاحب صدیقی، صفحات ۳۳۸، کتابت وطباعت عمدہ، ناشر انجمن ترقی اردو ہند، علی گڑھ، قیمت للعہ؍

آج سے سوا صدی پہلے صوبہ شمالی و مغربی یعنی اترپردیش، دلی اور پنجاب میں جو اردو اخبارات و رسائل نکلتے تھے، یا جو مطابع طباعت کا کام انجام دیتے تھے، آج کی طرح اس وقت بھی ان کی سالانہ رپورٹ حکومت تک پہنچتی تھی، وہ رپورٹیں بہت ہی مکمل اور معلومات افزا ہوتی تھیں، مثلاً اخبار کی پالیسی، زبان، طرز نگارش، خبر کی نوعیت اور خریداروں کی تعداد وغیرہ سبھی باتیں

ان میں درج ہوتی تھیں، پھر ان رپورٹوں پر سکریٹری کا ایک تبصرہ ہوتا تھا، انہی رپورٹوں کی روشنی میں انیسویں صدی کے نصف اول کے محض ۶ برسوں میں یعنی ۱۸۴۸ء سے ۱۸۵۳ء تک جو اخبارات ان صوبوں سے نکلے تھے یا جو کتابیں چھپی تھیں عتیق صاحب نے ان کو مرتب کرکے شائع کردیا ہے، سرکاری رپورٹوں کے ساتھ مرتب نے اس میں دوسرے ذرائع سے بھی اچھا خاصا اضافہ کیا ہے، اس رپورٹ کی اشاعت سے اردو صحافت کی ابتدائی تاریخ مرتب کرنے میں بڑی مدد ملے گی امید ہے کہ ان رپورٹوں کی اشاعت کا سلسلہ برابر جاری رہے گا۔

سہل تجوید۔ از قاری سید کلیم اللہ صاحب حسینی، صفحات ۸۰، کتابت و طباعت عمدہ، ناشر دار القرآن والدینیات الکلیمہ، حیدرآباد دکن، قیمت عہ

فن تجوید پر اردو میں جو کتابیں اور رسالے لکھے جاچکے ہیں انہی میں سہل تجوید بھی ہے، جو پانچویں بار شائع ہوئی ہے اس کے مصنف محض قاری نہیں ہیں، بلکہ لندن سے پی، ایچ، ڈی ہیں، اور جامعہ عثمانیہ میں فارسی کے پروفیسر رہ چکے ہیں، یہ رسالہ واقعی اسم بامسمی ہے، اس فن سے دلچسپی رکھنے والوں کو اس کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے، بلکہ ابتدائی درجات میں یہ داخل نصاب کرنے کے لائق ہے۔

ہماری نعت۔ از شفیع الدین صاحب نیر، صفحات ۳۲، کتابت و طباعت اعلیٰ، ناشر کتب خانہ انجمن ترقی اردو، اردو بازار، دہلی ۶، قیمت تیس نئے پیسے

نیر صاحب کی متعدد کتابوں کا تعارف معارف میں ہوچکا ہے، یہ کتاب محض نعت نبوی پر مشتمل ہے، جو انھوں نے چھوٹے بچوں کے لیے لکھی ہیں، مولانا عبد السلام صاحب ندوی قدوائی نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ "اس میں نیر صاحب نے دل کے ساتھ عقل کو بھی متاثر کرنے کی کوشش کی ہے" امید ہے کہ اسلامی نظموں کی طرح ہماری نعت بھی بچوں میں مقبول ہوگی، اس میں نعتیہ نظمیں اس ترتیب سے لکھی گئی ہیں کہ اس سے سیرت نبوی کا پورا خاکہ بچوں کے ذہن میں آجاتا ہے۔

م - ج

جلد ۹۳۔ ماہ رمضان المبارک ۱۳۸۳ھ مطابق فروری ۱۹۶۴ء عدد ۲

فہرست مضامین